



عمیرہ احمد

کچھ

آپ حیات کی کافی تلاش کے تیرپتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت انسان نے ایسا اور سارا کو بچا کر دیا ہے۔ سارا نے ایسا کو امر و گلز سے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے ایسا شادی سے قبل پہنچتی تھی اور وہ اسے اس کے والد باشم نے دے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دس سے قبول کیا۔

3۔ جی جی اسے ہیرو کو ان کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروڈیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری ٹیم کے تمام یہودی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر عملی مشکلات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے نو انٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر بات چیت کر سکیں۔ لیکن اس شخص پر سمیت اس کی ٹیم کے حمایت و خلاف رہا کر دے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں آئی۔ نئے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس ٹیم کی کسی ٹی کی تاریخ یہ انٹ کے حوالے سے کوئی معاملہ جانتا ہے۔

4۔ وہ نئی باتوں سے تحقیق میں تھی۔ سکون تو رہا وہ بات کے بغیر سو میں پاری تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سو بار



کرتے تھے بھی کہ اس نے اس کی ٹیلی کو کیوں مار ڈالا۔

۵۔ اسپیننگ کی کے ہاتھ مقابلیہ کے فاعل میں تھو سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تھو سالہ نفسی نے نو حرفوں کے فقط کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بیٹے نے کیا رو حرفوں کے فقط کی درست اسپیننگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست بھی بتائے پر وہ مقابلیہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تھو سالہ پکی دوبارہ فاعل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ میں کہ اس خود اعتماد مطمئن اور وہ بیٹے کے چہرے پریشانی جھلی جھٹکے دیکھ کر اس کے والدین اور بلی کے دیگر مسلمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

۸۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بدادہ تھی کہ وہ بلی سے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فاعل میں رکھ دیا۔

۷۔ وہ دونوں ایک ہوئی کے بار میں تھے۔ ٹرکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر موٹے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ ٹرکی نے پھر وائس کی آفر کی جس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ ٹرکی اس موٹے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں گفتی تھی۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

۹۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ گئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملیل نظر آتی ہے۔

۱۰۔ وہ پیسے ہی گھر آیا۔ مضمون کے مطابق اس کے دونوں بیٹے اپنا تحصیل چھوڑ کر اس کے گلے آگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو قیصری بار امید سے بھی جس کا پتہ پاک استقبال کیا۔ وہ لاٹ میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور رکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند ہی عرصہ بعد کر چھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ ضروری فحش آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی ٹیلی اور اسٹیلی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پرنسٹنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ گڈنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ شخص کی طویل نشست کے بعد اسے چند روزہ منٹ کا وقت دینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزا نمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے بخنی پڑا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور محبت تھی۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان امر پورٹ پر چانکات اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ غلبہ رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے حرام ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گہری جھیل میں وہ صندل کی گڑبڑ کی گھنٹی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر ہے اپنا نمٹ کے بیہ رویہ کی کڑی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساتھ فٹ کے فاصلے پر اس جینکوٹ جال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم ٹونج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ چند روزہ منٹ بعد وہ سمان جینکوٹ جال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک

پروفیشنل شوٹ ہے۔ اسے سمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہار کیا گیا ہے۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجوی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر وہ ان لیتا ہے۔ نجوی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو ٹیکریں ہیں۔ دو سری ٹیکریں مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدمو حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو نو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا سارا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سوئے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر صبحی کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے امامہ صبحی کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ ماہاں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ ماہاں کو سالار پر سخت فہم آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سیٹ علی کو بھی بتاتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سیٹ علی کے گھر امامہ کا رو کھا رویہ محسوس کرنا سے سعیدہ ماہاں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ ماہاں کے ہی گھر رہ رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آئندہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے ہی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان، طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا رویہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سیٹ علی امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ سی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اسی جی نہیں تھی جتنی اس نے بنا دی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سیٹ علی سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپس پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواب دیتے ہوئے دبی جاتی ہے جو سعیدہ ماہاں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آئندہ تکلیف دیتے ہیں پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو کسی اور سے نہ کرنا ڈاکٹر سیٹ علی بتاتا ہے کہ اس کے ساتھ سعیدہ ماہاں کے گھر سے جیز کا سامان لے کر آتا ہے جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سیٹ علی نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کھانا روٹوں کی بوتلیں دیکھ کر سالار کو کوشت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تکلف کرنے کا سونپا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مرتجع کروا رہا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور اپر پورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید فہم آتا ہے۔ مگر بچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

پانچویں قسط

وہ جس شیشے سے اسے دیکھ رہی تھی وہ پھر دھندلا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سالار سے اگلا جملہ کیا کرے۔ وہ دوبارہ اپنی ای میل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ کتاب میں امامہ کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈیپریشن کے دورے کا اتنا زخمنے سرے سے ہوا تھا۔ دوسرے بینڈ روم کے ہاتھ روم میں آکر وہ بے مقصد اپنا دایاں ہاتھ دگر دگر کر دھوتی رہی۔ یہ احتمال حرکت تھی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا، لیکن وہ اس وقت اپنی ذہنی پریشانی لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ وہ شراب کا ایک گلاس نہیں تھا، بلکہ اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی پہلی کھالی تھی، پہلی اور سب سے بڑی۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو رہا تھا کہ وہ ایسی کچنی کے ہوتے ہوئے شراب سے مکمل اجتناب کرتا ہو گا اور شراب پینے کا کیا مطلب تھا۔؟ یہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے مقصد گھر کے ہر کمرے میں بھرتی رہی۔ نیند مکمل طور پر اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔

”اللہ سکون کے آسمان کو اندیشوں کی زمین کے بغیر کیوں نہیں کھڑا کرتا؟“ اس نے میرس سے بے مقصد نیچے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ اس تاریکی اور سردی میں کتنی ہی دیر میرس کی ریٹنگ کے پاس کھڑی بیٹھ دیکھتی رہی، اسے وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو یہاں؟“ اپنے عقب میں سالار کی آواز نے اس کی سوجوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ کمرے سے اس کی طویل عدم مہم دوہی کی وجہ سے اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا۔

”میں۔۔۔؟“ امامہ نے چونک کر اپٹ کر اسے دیکھا۔ ”میں نیچے دیکھ رہی تھی۔“

”نیچے کیا ہے؟“ سالار نے اس کے قریب آکر نیچے جھانکا۔

”نیچے۔۔۔؟“ امامہ کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس نے نیچے کیا دیکھا تھا۔

”نیچے۔۔۔؟“ کچھ بھی نہیں۔ ”سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسے غائب دماغ لگی تھی غائب دل لیا پھر پریشان۔

”اندر چلیں؟“ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی شان ٹھیک کرتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آگئی۔

”تم سو جاؤ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔“ اس نے اندر آتے ہوئے سالار سے کہا۔

”میں کچھ دیر بیوی دیکھوں گی۔“ سالار ٹھنک گیا۔

امامہ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیے اب بیوی آن کر رہی تھی۔ شاوی کے بعد پہلی مرتبہ بیوی میں اتنی دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔

”بیوی پر کوئی خاص پروگرام آ رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ویسے ہی دیکھوں گی۔“ امامہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے۔

وہ جانے کے بجائے مصوفے پر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے ریوٹ کنٹرول لے کر پی ڈی آف کیا اور ریوٹ کنٹرول سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

امامہ نے کچھ جزیروں کو اس سے دیکھا۔

”میں شراب نہیں پیتا امامہ! میں یہ پھل کچھ چکا ہوں اس کا ذائقہ کیسا ہے اس کا اثر کیا ہے۔ میں دونوں سے واقف ہوں مجھے شراب میں کوئی تم ڈبوئے ہے نہ کسی سُور کی تلاش ہے۔ میرے لیے یہ ان گناہوں میں سے ایک ہے جن کو میں چھوڑ چکا ہوں۔ تم ہر روز اللہ تعالیٰ سے بس یہ دعا کیا کرو کہ وہ مجھے سیدھے راستے سے نہ

بھٹکائے۔“ وہ اس سے سوال کی توقع کر رہی تھی، جواب کی نہیں۔ وہ جیسے کسی سائیکالوجسٹ کی طرح اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

”اب تمہیں پی ڈی دیکھنا ہے تو دیکھو ڈورن آکر سو جاؤ! گڈ نائٹ۔“

اس نے پی ڈی آن کرتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں ریوٹ کنٹرول دیا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”انسان کو کون سی چیز بدل دیتی ہے؟ وقت؟ حالات؟ زندگی؟ تجربہ؟ تکلیف؟ غلاش؟ محبت؟۔۔۔ یا پھر اللہ؟“ اس نے پی ڈی آف کرتے ہوئے سوچا۔



سالار کے ساتھ اس گفتگو نے اس کے لیے بہت آسانی پیدا کر دی تھی۔ دوبارہ ڈورن پر جاتے ہوئے امامہ نے وہاں آنے والے لوگوں کو اس طرح نہیں جانچا تھا جس طرح پہلی بار جانچا تھا۔ اس بار وہ اسے اتنے برے نہیں لگے تھے جتنے پہلی بار لگے تھے، پہلے کی طرح اسے احساس کثرتی کا دورہ پڑا تھا، نہ ہی احساس برتری کا دورہ، نہ ہی نیم عریاں لباس میں عورتوں کو دیکھ کر اس نے کسی احساس برتری کی ٹوپی پہنی تھی اور ان تعصبات کے بغیر اس کے لیے وہاں جانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔

”تم کسی سے کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟“

وہ شاید چوتھا ڈورن تھا، جب وہ اپنی پر رات کو سونے سے پہلے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ نابل پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔

”کیسی بات؟“

”کوئی بھی بات۔۔۔؟“ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”جب کوئی مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو میں جواب دیتی ہوں۔“

”لیکن تم بھی تو کسی سے کچھ پوچھا کرو۔“ وہ ان پارٹیز میں اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹس کر رہا تھا۔

”کیا پوچھا کروں؟“

سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھی۔

”تم حال چال پوچھو پچھر تم فیملی کے بارے میں پوچھ سکتی ہو، بچوں کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ فار گاڈ سیک

امامہ! عورتوں کو تو یہ نہیں بتانا پڑا کہ انہیں آپس میں کیا باتیں کرنی ہے۔“ وہ اسے بتاتے جاتے کچھ سٹنٹا سا گیا۔

”اچھا! میں کوشش کروں گی۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”میرا یہی سوشل سرکل ہے، یہی لوگ بار بار ملیں گے تمہیں ان ہی میں سے تم نے دوست بنائے ہیں۔“
 ”لیکن میں نے دوست بنا کر کیا کرنا ہے؟“ اس نے دوبارہ ٹاول کھولتے ہوئے کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر ٹاول
 اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”تو نہیں اچھی ہوتی ہیں لیکن ایک دنیا ان کے باہر ہے، وہ بھی اچھی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی
 رہتی۔

”لوگوں سے چھپ چھپ کر بھاگ بھاگ کر اب بہت مشکل ہو گیا ہے دوبارہ ان کے ساتھ چلنا۔“ وہ خود
 بھی سمجھ نہیں پاتی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔

”اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ انٹر ایکٹ کرو۔ اب ضرورت نہیں رہی چھپنے کی، یہاں میں تمہیں
 لے کر جاتا ہوں، وہاں تم میری فیملی ہو۔ وہاں کوئی تم سے تسماری فیملی کے بارے میں انوسٹمنٹی گیٹ نہیں کرے
 گا۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”اچھا میں کوشش کروں گی۔“

اس نے غیر محسوس انداز میں سالار کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔
 ”بھابھی کے ہاں بھی جایا کرو۔“ وہ اسے نوٹیشن کے بارے میں کہہ رہا تھا۔
 ”جاتی ہوں۔“ اس نے نالٹے والے انداز میں کہا۔

وہ اسے چپ چاپ کچھ دیر دیکھتا رہا۔

”اب اس طرح مت دیکھو مجھے۔“ امامہ نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے گردن موڑ کر
 کہا۔ ”میں نے کہا ہے تاہم کوشش کروں گی۔“

وہ کچھ کہنے کے بجائے مکمل کھینچتا ہوا پت لیٹ گیا تھا۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی، لیکن کچھ دیر بعد اسے سالار
 کی نظریں پھر نوڈر پر محسوس ہوئی تھیں۔

”اب کیا ہے؟“ اس نے کچھ جھنجھلا کر سالار کو دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ امامہ نے اس کی نظروں میں کوئی بے حد عجیب سا تاثر محسوس کیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے کچھ
 سوچ رہا تھا۔



عید کے دو ہفتے کے بعد اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ان کے ولیمہ کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اگر سالار کی
 ضد نہ ہوتی تو سکندر کبھی اس تقریب کے لیے اسلام آباد کا انتخاب نہ کرتے، لیکن سالار کی ضد کے سامنے سکندر
 نے بالآخر ٹھنڈے ٹیک ویسے تھے۔ سکندر کے دوسرے بچوں کے برعکس ولیمہ کی یہ تقریب خاصی سادگی سے ہوئی
 تھی۔ میز دک کا وہ اہتمام جو سکندر کے گھر کی تقریبات کا حصہ سمجھا جاتا تھا، وہ اس تقریب سے غائب تھا۔ مینو اتنا
 یوش نہیں تھا جتنا پہلے ہوتا تھا، لیکن مہمانوں کی تعداد تقریباً ”اتنی ہی تھی، جتنی عام طور پر سکندر کی تقریبات میں
 ہوا کرتی تھی۔“

دو ہزار کے قریب افراد کی موجودگی میں امامہ انتہائی غیر آرام دہ۔ محسوس کر رہی تھی، جتنا اسے کرنا چاہیے
 تھا۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد سے دو پہلے ہی سالار کی عید ملن پارٹی اور دوسرے ڈنر میں چند دن پہلے واقف ہو
 چکی تھی۔ اب تعارف کچھ نئے طریقے سے اور دوبارہ ہو رہا تھا۔ اُن کھڑے ٹیبل ہونے کے باوجود وہ خوش تھی اور

طمانیت کا احساس لیے ہوئے تھی۔ وہ باقاعدہ طور پر سالار کی فیملی کا حصہ بن کر جیسے کسی بچہ کی چھٹی آنٹی تھی۔ وہ ولیمہ کے بعد دو بھتیجے کے لیے بھہکاس گئے تھے۔ پاکستان سے باہر سالار کے ساتھ امامہ کا یہ سہلا سفر تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ بھی ان پندرہ دنوں جیسے پر سکون اور بے فکری کے دن ان کی زندگی میں دوبارہ بھی نہیں آنے والے تھے۔ وہ زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت جگہوں پر اس سے زیادہ سہولت کے ساتھ جاتے تب بھی زندگی کے ان دنوں کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ جب ان دنوں کے درمیان رشتہ نیا تھا لیکن تعلق پر اتنا جذبہ ایک دوسرے پر اعتماد زیادہ نہیں تھا، لیکن توقعات اور امیدیں بہت تھیں اور جب ان دونوں کے درمیان ابھی شکایتوں اور تکیوں کی دیواریں کھڑی نہیں ہوئی تھیں، زندگی ایک دوسرے سے شروع ہو کر ایک دوسرے پر یہی ختم ہو رہی تھی۔

سالار کا فون انٹر نیٹل روٹنگ پر تھا، لیکن دن کا زیادہ وقت وہ آف رہتا تھا۔ پینک اور اس سے متعلقہ کاموں کو پندرہ دنوں کے لیے اس نے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور ایک سیل کے آف رہنے سے ان کی زندگی میں حیران کن تبدیلی آئی تھی۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت تھا اور اس وقت میں سیل فون بد اخلاقت نہیں کہہ رہا تھا۔

ایک دوسرے سے کئی جانے والی ساری باتیں بے معنی تھیں، ساری باتیں بے مقصد تھیں اور ساری باتیں "ضروری" تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے بچپن، اپنے ماضی کے سارے قصے، ساری خوشگوار باتیں جاتے رہے تھے جو ایسے ہی فریٹس اور resorts سے جڑی ہوئی تھیں۔

سمندر کے پانی کے اس جھیل نما حصے پر بنے بہت سے راتھوز میں سے ایک پر بیٹھے، شفاف پانی میں نظر آتی مختلف قسم کی آبی مخلوق کو دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے انہیں پتا نہیں کیا گیا یا داتا رہتا، پھر انہیں ہنسی کے دورے پڑتے۔ بے وجہ ہنسی جس کا تعلق کسی چیز سے نہیں، صرف اس ذہنی کیفیت سے تھا جس میں وہ ان دنوں تھے۔

سالار بھہکاس پہلے بھی دوبارہ آچکا تھا اور اس کے لیے وہ جگہ بنی نہیں تھی۔ وہ اسے لے کر ان تمام جگہوں پر جا رہا تھا، یو سی فوڈز کے لیے مشہور تھیں اور امامہ کو پہلی بار اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کس حد تک سی فوڈ پسند ہے۔ خود اس نے سالار کے اصرار اور دباؤ کے باوجود پھل کی کٹاؤں کے علاوہ کسی دوسری چیز کو چکھنے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔

"ہم اپنے گھر میں اس طرح کا ایک رانچ بھی بنوائیں گے۔"

وہ اس رانچ پھر لکڑی کے تختے پر آکر پانی میں ٹانگیں ڈبوئے بیٹھے تھے، جب امامہ نے کہا۔

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اسے مذاق سمجھا تھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ، جھکی ہوئی پانی کو مٹھی میں لیے اجماع رہی تھی۔

"کس پر ہوتا میں گے؟" سالار نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

"جھیل پر۔" وہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"اور جھیل کہاں سے آئے گی؟" وہ ہکا بکا تھا۔

"وہ تمہارے گھر کا۔" وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اور اس جھیل میں پانی کہاں سے آئے گا؟"

امامہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

"نہر کے ذریعے۔" وہ ہنس پڑا لیکن امامہ نہیں ہنسی۔

”پانی کی ضرورت لانا دودھ کی ضرورت زیادہ مشکل ہے سویت ہارٹ!“
اس نے امامہ کے کندھوں پر بازو پھیلا لیا۔ امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
”تم نہیں بنا کر دو گے؟“ وہ سوال نہیں تھا، وہ مشکل تھی۔

”ہم یہاں آیا کریں گے، بلکہ اگلے سال میں تمہیں مارشلس لے کر جاؤں گا، پھر اس سے اگلے سال
مادہ ہے۔“

امامہ نے اس کی بات کانفی۔

”تم نہیں بنا کر دو گے جھیل؟“

”امامہ! جھیل کیسے بنا کر دوں میں تمہیں۔؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر گھر بنائیں جہاں قدرتی
طور پر آس پاس اس طرح پانی ہو۔“ سالار نے اسے ٹانے کی کوشش کی تھی۔

فی الحال وہ اسے صاف لفظوں میں اس رائج پر پینہ کر اپنے بنی مومن ٹرپ کے دوران اور غیر مردہ مانوی باتوں

کے درمیان پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عقل سے پیدل ہے اور جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہے اور وہ بھی احتمالاً۔

”ہاں یہ جھیک ہے۔“ اس پر وقت اثر ہوا تھا اور سالار نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

”سالار تم بہت اچھے ہو۔“ امامہ نے اب اس کا ہاتھ پیار سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”امامہ! یہ بلیک میلنگ ہے۔“ سالار نے ہاتھ چھڑاتے بغیر گراسانس لے کر احتجاج کیا۔ وہ اس کے جھوٹ کو

اس کے گلے کی ہڈی بتا رہی تھی۔

”ہاں! ہے تو۔“ اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکا کر پستے ہوئے کہا۔

وہاں باقی دن امامہ نے اس رائج کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تھا اور سالار نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے امید تھی وہ

اس رائج کے بارے میں بھول گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔

واپس آنے کے چوتھے دن بعد اس نے غریب انداز میں سالار کو اس گھر کے نئے ڈیزائنز دکھائے تھے۔ وہ جھیل

اور رائج بھی اس کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ اب اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ بنی مومن اسے بہت مددگار تھا۔ وہ دنیا کی

پہلی بیوی تھی جس نے اپنے بنی مومن ٹرپ پر ایک جھیل اور رائج کی شاپنگ کی تھی۔ اور وہ دنیا کا پہلا شوہر تھا

جس نے اس شاپنگ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر اب کچھ اور تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ اور یادوں اور خوشگوار لمحوں کا۔ ان

کے ولیمہ کانفرنسز۔ تین طر کے شرارے میں بلیک ڈنر سوٹ میں لمبوز سالار کے ساتھ وہ پہلی پارولسن کے

روپ میں تھی۔ وہ سالار کی فیورٹ تصویر تھی۔ اور ان کے بنی مومن کی تصویریں جس میں تقریباً ”ایک جھیلی

سفیدی ٹرٹس میں وہ ایک بیچ پر کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان ساری تصویروں میں صرف ایک چیز کامن تھی ”ان

کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خوشی اور چمک“ ان کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ بنو ان تصویروں پر

نظر ڈالنے والی کسی بھی پہلی نظر کو ایک لمحہ کے لیے مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

They were made for each other

(وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔)

کم از کم وہ تصویریں ہر لحاظ سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔



زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آ رہی تھی۔ سالار واپس آنے کے بعد مصروف ہو گیا۔ وہ بیک سے تقریباً دس بجے گھر آیا تھا اور پہلے کی طرح گھر سے کافی کے لیے باہر نکلنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت صبح ناشتے کی میز پر ہو رہی تھی یا رات کے کھانے کی میز پر۔ سالار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے پر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسے کھانے سے زیادہ اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ان باتوں میں دلچسپی تھی جو وہ اس کے ساتھ کیا کرتی تھی اور سالار کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے بالآخر اسے ایسے کھانا کھا لینے پر مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ نو شین کے ساتھ اب وقتاً فوقتاً گھر سے نکلنے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ اب گھر سے باہر تک بڑھنے لگا تھا اور سالار اس چیز کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ اس کی اتنی پکڑ چلنا چھوڑے اور یہ تب ہی ممکن تھا اگر اسے اس کے علاوہ پکڑنے کے لیے کچھ اور ہاتھ نظر آتے۔



وہ اس دن چینل سرفنگ کر رہی تھی جب اس کی نظریں ایک چینل پر پھری گئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے

اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اسٹاک مارکیٹ کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا اور اس میں شامل وہ شرکا میں سے ایک سالار بھی تھا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اسکرین پر سالار کو دیکھ رہی ہے لیکن چند لمحوں کے بعد سالار کا نام اور اس کا عہدہ اسکرین پر چند لمحوں کے لیے غائب ہوا۔

”تو وہ مجھ سے بصورتِ بول رہا تھا۔؟“ امامہ نے اس کا عہدہ دیکھ کر سوچا۔ وہ بی آر سے منسلک نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایسا خند بھی کہ اس نے سالار کے بصورت اور اس کی وجوہات پر غور ہی نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے فائرس سے متعلق کوئی پروگرام اسے شوق اور لگن سے دیکھا تھا۔ وہ سالار کو اکثر اسی طرح کی گفتگو فون پر کرتے سن چکی تھی اور اس نے بھی اس پر غور بھی نہیں کیا تھا، لیکن اسکرین پر آجوا کھنڈہ اس پروگرام میں اسے سنتے اور دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت اچھے بیٹا تھا۔ کمپوزر کا فیڈ بک اسے بے حد شارب ایک مکمل پروفیشنل۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کی شکل و صورت اور پرستائی پر غور کر رہی تھی جو پہلی بار ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ شادی کے تقریباً دو مہینے کے بعد پہلی بار بی بی پر اپنے شو پر کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

سالار کسی پوسٹ انج میٹنگ میں تھا جب امامہ نے اسے فون کیا۔ میٹنگ تقریباً ختم ہو رہی تھی اس لیے وہ کال لیتے ہوئے بورڈ روم سے نکل گیا۔

”سالار! تم بی بی پر آئے ہو؟“ امامہ نے پھونکنے ہی اس سے کہا۔

ایک لمحے کے لیے سالار سمجھ نہیں سکا۔

”کیا؟“

”تم بی بی چینل پر آئے تھے ایک پروگرام میں اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟“

”وہ وہاں پہلے ریکارڈ کیا تھا انہوں نے“ لہجہ کیا ہو گا۔ ”سالار کو یاد آ گیا۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ اس نے موضوع بدلا، لیکن امامہ کس حد تک اس پروگرام سے متاثر تھی اس کا اندازہ اسے رات کو گھر آکر ہوا تھا۔

”میں نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔“ وہ کھانا کھا رہے تھے جب امامہ نے اچانک اسے بتایا۔

”کسے؟“ وہ چونکا، یونکہ وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔

”تم سارے اس پروگرام کو۔“

”اس میں ریکارڈ کرنے والی کیا بات تھی؟“ وہ حیران ہوا۔

”تمہاری بی بی پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔“ امام نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”اور تم انٹرنیشنل ٹینکنگ میں ہو۔ لی آر میں نہیں؟“ امام نے اسے جتایا۔

وہ مسکرایا لیکن اس نے جواباً اسے کچھ نہیں کہا۔

”تم نے دیکھا ہے اپنا پروگرام؟“

سالار نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”سوئٹ ہارٹ! ایسے بہت سارے پروگرامز ہوتے ہیں جن میں ہر روز بہت سارے ایکسپرس بلائے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اسے ریکارڈ کر کے بی بی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے اس سے پہلے بھی میں ایسے کئی پروگرامز میں آچکا ہوں اور آئندہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا رہوں گا۔ میرے بینک کی اس سیٹ پر جو بھی بیٹھا ہو ناؤ وہیں بزنس چھینل یا ایسے پروگرامز میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔ یہ بھی میری جاب کا ایک حصہ ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھپک کر اب دوبارہ کانٹا اٹھا رہا تھا۔ امام چند لمحوں کے لیے نہیں بول سکی۔ اس نے جیسے ٹھنڈے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس پر اٹھایا تھا۔ اس نے اسے کچھ ایسے ہی شرمندہ کیا تھا۔

”سالار! سو حرام ہے نا؟“

وہ خود سمجھ نہیں پائی کہ اس نے سالار کی بات کے جواب میں یہ کیوں کہا۔ شاید یہ اس شرمندگی کا رد عمل تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے اٹھائی تھی۔

”ہاں۔“ وہ کانٹے سے کباب کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے ”صرف ایک لمحہ کے لیے ٹھنڈا تھا۔“

”بالکل اسی طرح جس طرح جھوٹ حرام ہے۔ غصہ حرام ہے۔ غیبت حرام ہے۔ بددیانتی حرام ہے۔“

منافقت حرام ہے۔ تمہارا گانا حرام ہے۔ ملاوٹ حرام ہے۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”میں ان چیزوں کی بات نہیں کر رہی۔“ امام نے اس کی بات کاٹنی اس نے جواباً ”امامہ کی بات کاٹی۔“

”کیوں۔؟ کیا ان ساری چیزوں سے انسان اور معاشرے کو کم نقصان پہنچتا ہے؟“

امامہ کو جواب نہیں سوجھا۔

وہ صرف بی بی کے پروگرام میں بیٹھا ایسی گفتگو کرتا، امپریڈ بولنگ رہا تھا ”حقیقی زندگی میں اس طرح لا جواب ہونا“ کچھ زیادہ خوش گو اور تجویز نہیں تھا امامہ کے لیے۔

”تم جتنی فانی کر رہے ہو سو کو۔؟“ اس نے بالآخر کہا۔

”میں میں جتنی فانی نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم ”جز“ کو ”کل“ سے الگ نہیں کر سکتے۔“

اسلامی معاشرے کو سو دانتا نقصان نہیں پہنچا رہا جتنا وہ سری خرابیاں۔ ”وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔“

”میں اگر پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی ہانچ خرابیاں بتاؤں اور کہوں کہ ان میں سے کوئی ایک ختم کرو،“

جس سے معاشرہ بہتر ہو جائے کرپشن کو۔؟ غریب کو۔؟ نا انصافی کو۔؟ بددیانتی کو۔؟ یا سو کو۔؟ میں شرط

لگا تا ہوں امامہ! کہ یہ سب کچھ آپشن کبھی کسی کی پہلی ترجیح نہیں ہو گا۔“

وہ چیلنج کر رہا تھا اور یہ چیلنج جیت بھی سکتا تھا یونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پہلی چار میں سے ہی کسی ایک

خرابی کو حتم کرنا چاہیے گی، امام نے دلی ہی دل میں اعتراف کیا۔
 ”اور سو صرف بینکنگ میں تو نہیں ہے۔ کوئی یونیٹیٹیٹل لیٹ ہوتا ہے تو اس پر سرچارج لگ جاتا ہے اسکول کالج کی فیس لیٹ ہو جاتی ہے تو فائن لگ جاتا ہے۔ یہ بھی تو سود کی قسمیں ہیں۔“
 اس کے پاس اس کی توجہ ممت کا کوئی جواب نہیں تھا۔
 ”تو تم بینکنگ میں اس لیے ہو کیونکہ تم سود کو دوسری برائیوں جیسی ایک عام برائی سمجھتے ہو؟“ امام نے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔

”نہیں میں اسے بہت ہی لعنت سمجھتا ہوں تو پھر میری سوچ سے کیا تبدیلی آئے گی؟ یہ سوچ لے کر ساری دنیا کے مسلمان بینک میں کام کرنا بند کر دیں۔“ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے راستے کھلے چھوڑ دیں کہ وہ آئیں اور نیک اور کریم کریں۔ ہماری ان کا کوئی کو اپنی مٹھی میں لے لیں۔ جب چاہیں پیسے چاہیں ہمارا گناہا دیں۔ پاور اس کی جس کے پاس کیپٹل۔ یہ جو فنانشل سسٹم پوری دنیا میں چل رہا ہے ویسٹ کا قائم کردہ ہے، دو سرے مذاہب کے لوگوں کا ہے، انہوں نے اسے بنایا، پاپو راز کیا اور پوری دنیا میں پھیلایا۔ ہم کہاں سو رہے تھے اس وقت ہمیں اتنی کمزور تھی تو پھر دو تین سو سال پہلے کھاتے۔ سود سے پاک ایک متوازی سسٹم بناتے اور چلاتے اس کو نہ کرتے ویسٹ کی تقلید یا پھر اب کوشش کریں اس سب کو تبدیل کرنے کی، لیکن اس کے لیے بینکوں میں کام کرنا پڑے گا۔ دنیا میں قح تکس جو بھی جنگ جیتی گئی ہے وہ اس نے جیتی ہے جو میدان میں تلوار لے کر اترتا ہے۔ میدان سے باہر کھڑے لوگوں نے بڑی سے بڑی گالیاں بھی دی ہوں تو بھی بینک ملازمتوں اور مذمتوں سے کبھی نہیں جھکتی جاتی تو میں اپنی مہارت سے تلوار کا کام لینا چاہوں گا میری زبان شاید اتنی موثر نہ ہو۔“
 امام اعلیٰ نظروں سے اسے دیکھتی رہی، سود کے بارے میں یہ ان کی پہلی بحث تھی۔



رمضان میں اور اس کے فوراً بعد امام کو کھانا پکانے کا کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اب وہ اس کے لیے باقاعدہ طور پر گھر کا کھانا بنانے لگی تھی۔ وہ سی فوڈ کے علاوہ کسی خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا۔ سی فوڈ کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ باہل خواستہ اس کے لیے ہفتے میں ایک دو بار دیوں میں بند سی فوڈ کے بجائے بازار سے تازہ سی فوڈ لے کر پکانے لگی تھی۔

صرف پہلی بار ان تازہ برائز گریٹس اور لوہسٹوز کو پکانے کے لیے صاف کرتے ہوئے اسے اتنی شدید کراہت محسوس ہوئی تھی کہ اسے رونا آگیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ صبح کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ سنگ اپریا میں فی وی دیکھتے اور کسی دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے سالار کو وہم سا ہوا تھا کہ وہ سنگ کے سامنے کھڑی رو رہی ہے اور یہ وہم اس لیے ہوا کیونکہ اس کال کے آنے سے پہلے وہ دونوں آپس میں بے حد خوشگوار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ وہاں رونے والی کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر؟

ریکوت کنٹرول سے لی وی آف کرتے اور دوست کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں آگیا تھا۔ سنگ کے سامنے کھڑی وہ صرف رو نہیں رہی تھی بلکہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سالار کے چہرہ طبق روشن ہو گئے۔

”کیا ہوا؟“

سنگ میں رکھے برتن سے لوہسٹوز و محدود کوشاں برکتے ایک دوسرے برتن میں رکھتے ہوئے اس نے

سالار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ اسی طرح اپنے دونوں کاموں میں مصروف رہی۔ سالار نے ہاتھ جوھا کر سنگ کا تلہ بند کر دیا۔

”کیوں رو رہی ہو تم؟“ وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”امامہ۔۔۔“
”اپنے باپ کے گھر میں نے ان چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا بنیں اب مجھے صحت پڑ رہا ہے۔“ پانی دوبارہ کھولتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سی فوڈ اتنے ہی شوق سے کھائے جاتے تھے، لیکن وہ ان سے شدید قسم کی کراہت رکھتی تھی اور ان چیزوں کے پاس بھی نہیں پہنچتی تھی نہ ہی کوئی اس سے کہتا تھا۔ معلوم نہیں انسان کونسا باپ کا گھر کیوں حیات پر یاد آتا ہے۔

سالار کو کچھ دیر سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔
”میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتا کر دو۔“
”تم نے خود کہا تھا کہ میں تمہیں سی فوڈ لا کروں گا اور تم تنہا نہ بنانا۔“

سالار نے پھر کچھ فکلی سے پانی بند کیا۔
”چھوڑو مت بناؤ۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے دو برتن سنگ سے اٹھا کر شیش پر رکھ دیا۔
”یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی جب شوہر کو بتا کر کھلا سکتی۔ بس تو میں باپ کو بھی بتا کر کھلا دیتی۔“ اس نے رندہ صی ہوئی آواز میں کہا۔

کیا رنج تھا، کیا بچہ تھا، وہ اسے کچھ کر رہ گیا۔
اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے اس دن سی فوڈ ہی تیار کیا تھا۔ لیکن اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سالار کو اس قدر احساس جرم ہوا تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔
”میں آہستہ آہستہ یہ سی فوڈ کھانا چھوڑ دوں گا، تمہیں دوبارہ یہ گھر پر نہیں بنانا پڑے گا۔“
اس نے کھانے کے دوران اسی احساس جرم کے ساتھ کہا تھا۔
”نہیں، تمہیں پسند ہے تو کیوں چھوڑو گے؟ چاہ نہیں مجھے ایسے ہی خیال آگیا تو۔ آہستہ آہستہ میری ٹاپسندیدگی کم ہو جائے گی۔“ وہ اب اس ساری ہوتہ حال پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔
”میں۔۔۔“

امامہ نے اس کی بات کا تشددی۔ ”رہنے دو بس۔ اگر کچھ چھوڑنا ہے تو یہ ہو تم انرجی ڈرنگس وغیرہ پیتے رہتے ہو انہیں چھوڑو۔ میں تمہیں کچھ فریش جو سوز وغیرہ بنا دیا کروں گی۔“
وہ نفس پڑا تھا۔ وہ ان ڈرنگس کا واقعی بہت زیادہ عادی تھا اور اس کی بنیادی وجہ اس کا لاکھ اشاکل اور پروفیشن تھا۔ ان انرجی ڈرنگس کے سہارے وہ ساری ساری رات بے حد آرام سے کام کرتا رہتا تھا اور فی الحال اس عادت نے اس کی صحت پر کسی قسم کے منفی اثرات نہیں ڈالے تھے۔ سی فوڈ کی نسبت انہیں چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔
اسے کھانے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی نہ ہی اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ کوئی اس کے لیے کھانے کے لوازمات کا اہتمام کرے یا اسے پیش کرنا پھرے، لیکن اسے اندازہ بھی نہیں ہوا پورا تھا کہ کتنے غیر محسوس انداز میں وہ امامہ کے ہاتھ کے کھانے کا عادی ہونے لگا تھا۔ امامہ اس کے رات کو بہت دیر سے گھر آنے پر بھی اسے تازہ چپاتی بنا کر دینے کی عادی ہو گئی تھی اور سالار نے زندگی میں کبھی ایسی چپاتی نہیں کھائی تھی۔ کسی کے گھر پر بھی نہیں ”نرم“ خوشبودار ڈاڈا نقد دار اور تازہ کئی بھی ڈزینیں پر۔ چپاتی کا پہلا قدمہ منہ

میں ڈالتے ہی اسے امامہ یاد آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چپاتی، کسی سالن، چٹنی یا سلاڈ کے بغیر بھی بڑی خوشی کے ساتھ کھا سکتا تھا۔

وہ ناشتے میں دو سلاکس ایک اینڈا کھا کر اور چائے کافی کے ایک کپ کے ساتھ بھاگ جانے والا آدمی تھا اور اب زندگی میں پہلی دفعہ ناشتے کا کوئی ”منہمو“ ہونے لگا تھا، اینڈا تلے ہوئے یا ابلے ہوئے کے بجائے مختلف قسم کے آبلٹ کی شکل میں ملنے لگا تھا۔ بعض دفعہ پر اٹھا ہوتا۔ ڈبے کے جوس کی جگہ تازہ جوس کے گلاس نے لے لی تھی۔ لچ کے لیے گھر کے بنے ہوئے سینڈوچز اور سلاڈ ہوتے۔ وہ آفس میں سب کی طرح ایک فاسٹ فوڈ سے آنے والے لچ بیک کا عادی تھا اور وہ اس کے ساتھ ”گھٹو نیبل“ تھا۔

شروع شروع میں وہ امامہ کے اصرار پر کچھ بے دبی سے اس لچ بیک کو گھر سے لاتا تھا جو امامہ اس کے لیے تیار کرتی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کی ناخوشی ختم ہونے لگی تھی۔ وہ ”گھر کا کھانا“ تھا، بے حد ”ویلیو ایبل“ تھا۔ کیونکہ اسے بنانے کے لیے صبح سویرے اٹھ کر اس کی پیوی اپنا کچھ وقت صرف کرتی تھی۔ ”بھوک“ وہ بازار سے خریدے گئے چند تھوکوں سے بھی مٹا لیتا، لیکن وہ سمجھے اس کے دل میں گھر میں بیٹھی ایک عورت کے لیے شکر کا احساس پیدا نہ کرتے، جسے وہ ہر روز اس وقت محسوس کرتا، جب بینک کے کچن سے کوئی اس کے لچ کو گرم کر کے اس کے ٹیبل پر لا کر رکھتا تھا۔

دیہانی کے اس گلاس کا بھی اسی طرح عادی ہونے لگا تھا، جو وہ ہر روز اس کے گھر میں داخل ہونے پر اسے لا کر دیتی تھی۔ کافی یا چائے کے اس کپ کا بھی، جو وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد نیرس پر بیٹھ کر پیتے تھے اور گرم دودھ کے اس گلاس کا بھی، جو وہ رات کو سونے سے پہلے اسے دیا کرتی تھی اور جسے وہ شروع میں ناگواری سے گھورا کرتا تھا۔

”میں دودھ نہیں پیتا۔“ جب اس نے پہلی بار گرم دودھ کا گلاس اسے دیا تو اس نے بے حد شائستگی سے بتایا تھا۔

”کیوں؟“ جواباً ”اس نے اتنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

”مجھے پسند نہیں ہے۔“

”مجھے تو برا پسند ہے، تمہیں کیوں نہیں پسند؟“

”مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

”تو میں اس میں اوو ٹینین ڈال دوں۔“ سالار نے اس کے جواب کو مکمل ہونے سے پہلے ہی گلاس اٹھا کر پی لیا تھا۔ وہ ذہن پرانی مسکاتا تھا، لیکن اوو ٹینین نہیں اور یہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دودھ پیتی ہے اس لیے اسے بھی دودھ پینا تھا۔ دودھ کے فوائد سے سر حال اسے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے اپنے گھر میں مردوں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا، وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھ رہی تھی۔

یہ ”عاماتہ“ تھا، ”خصوصاً“ نہیں اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ”خیال“ کریں ”رجسٹر“ ہو رہا تھا۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ سمجھتی تھی کہ اس کے ان تمام کاموں کو حق سمجھ کر لیا جا رہا ہے، کیونکہ ہر مرد کی طرح سالار بھی تعریف نہیں کر پاتا تھا، ہر مرد کی طرح اس کے لیے بھی اتنی لوبو کٹنا آسان تھا جیسے یہ کہنے کے کہ جو تم میرے لیے کرتی ہو اس کی جتنی بہت قدر ہے اور ہر مرد کی طرح وہ بھی اس احساس تشکر کو تھا تکف اور پیسے سے رہا پس کر رہا تھا۔

امار کے لیے زندگی بدل گئی تھی۔ بدل گئی تھی یا بہت عرصے کے بعد پھر شروع ہوئی تھی؟ مارکیٹوں میں سالار یا نو مشین کے ساتھ پھرتے چنزوں کو دیکھتے تو عجیب سے احساسات کا شکار ہوتی رہتی۔ یہ احساس کہ وہ جن چیزوں کو دیکھ رہی ہے وہ انہیں اب خریدنے کے قابل ہے اور یہ احساس کہ اب ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ ان چیزوں کو اپنے لیے رکھ سکتی تھی۔ وہ انگریز سید علی کا گھر نہیں تھا، بائبل نہیں تھا، نہ ہی سعید و ملاں کا گھر تھا، یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ لشکر، خوشی، آسوی اور پھر بے یقینی اور حیرانی۔ نو سال کی مشقت کے بعد جو ملا تھا وہ اس کی اوقات سے بہت زیادہ تھا اور یہ سب ہر کسی کو کہاں ملا تھا۔ نو سال بے نام، بے خانہ ان رہنے کے بعد اب جب کہ وہ ایک خانہ ان کا حصہ بنی تھی تو حیرانی کیسے نہ ہوتی۔؟ خواری اور بے سروسامانی کا سفر جہاں جا کر ختم ہوا تھا وہ نعمتوں کی معراج تھی۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے اتنے عرصے میں صرف ایک چیز سیکھی تھی۔ اپنے کس پر قابو پانا، اپنی خواہشات اور ضروریات کو کم سے کم کرنا، قناعت کرنا اور یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ آسانگوں سے نکل کر آئی تھی۔ رست کا ذرہ اسے تصور کے کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پیسوں کو کن کر خرچ کرنا اور پھر بچانے کی کوشش کرنا، وہ کہاں عادی تھی ان چیزوں کی، لیکن وقت اور حالات نے اسے عادی بنادیا تھا اور اب جب اتنے سالوں کے بعد اسے آسانگوں بنی تو ناممکن تھا کہ اسے بات بات پر وہ نو سال یاد نہ آتے۔ وہ ضرورت بننے پر سالار کی دراز میں پڑے پیسوں کو نکالتے ہوئے ٹھنک چنپا کرتی تھی مین کو کمانے میں اس کی محنت شامل تھی، نہ ہی ان کی بچت میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ دراز میں کتنی رقم موجود ہے، کیونکہ وہ انہیں کبھی گن نہیں پاتی تھی۔ وہ ہر روز اس دراز میں کچھ رقم کا اضافہ کرنے کا عادی تھا۔ اگر وہ اس دراز کو پورے کا پورا بھی خالی کر دیتی تب بھی اگلے دن وہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ اس روپے کو خرچ کرنا اس کا "احتیاج" تھا اور اس رقم کے خرچ ہونے پر

سالار نے کبھی اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس گھر کے سیاہ سفید کی مالک تھی۔ وہ چیزوں کو پر اس ٹیک دیکھ کر خرید کر کرتی تھی، اپنی خواہش دیکھ کر نہیں، اور اب ایک دم پر اس ٹیک دیکھ کر خرید اوری کرنا اس کے لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا۔ سالار زندگی میں خود بھی کبھی بارگشتہ گدا سستی چیزوں کے استعمال کا عادی نہیں رہا تھا اور وہ اتنی فیاض اس کے معاملے میں بھی تھا۔ ناممکن تھا کہ اسے جو چیز اچھی لگتی وہ اسے نہ لے کر دیتا اور یہ صرف بازار میں نظر آنے والی چیزوں تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ اسے کسی میگزین یا ٹی وی پر بھی کوئی چیز اچھی لگ جاتی اور وہ سالار سے اس کا ذکر کرتی تو وہ چیز اگلے چند دنوں میں اس کے گھر پر ہوتی تھی اور وہ کسی قیمت پر آتی تھی سالار کو پورا نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات کے تین بجے بھی اگر کسی چیز کے کھانے کی فرمائش کرتی تو وہ اسے لے جایا کرتا تھا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے۔"

وہ اب اس جیسے کو بولنے کی عادی ہو رہی تھی، کیونکہ کوئی تھا جو آدھی رات کو بھی اس کریم کے "اسکوپس" چائے کی ایک پلیٹ پڑا کے ایک سلاٹس "کافی" کے ایک کپ، ہلٹ اینڈ سار کی خواہش ہونے پر اسے ملامت یا صبر کی تلقین کرنے کے بجائے اسے ساتھ لیے مطلوب چیز کی تلاش میں، ایک بھی شکایتی لفظ لگے بغیر خالی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرتا تھا۔

شادی کے اس مختصر عرصے میں بھی لاہور کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کھانے کی کسی مشہور چیز کا اس نے سنا ہو اور سالار اسے وہاں نہ لے گیا ہو۔ گو الہندی میں فجر کے بعد حلوہ پوری کے سستے ٹاشٹے سے لے کر ٹلی سی کے چو میں گھٹے کھلے رہنے والے کیفے میں رات کے پچھلے پر کھائے جانے والے لیسن ٹارٹس تک جن کو کھاتے ہوئے گریو جانے پر اس نے دینی کی وہ فلاٹ بھی مس کر دی تھی جو ایک گھنٹہ بعد تھی۔

یہ ناممکن تھا کہ ایسا شخص کسی کی دعاؤں کا حصہ نہ بنے۔ اسے کبھی نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے سالار کو یاد

نہیں کرنا پڑا تھا وہ اسے بیٹھ خود بخود یاد آجاتا تھا۔ اس سے نکاح ہو جانے کے بعد پہلی نماز پڑھنے پر بھی جب وہ ناخوش تھی اور اس سے رشتہ ختم کرنا چاہتی تھی اور فاخر سید علی کے گھر پر اسے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی جب اس نے پہلی بار ”اپنے شوہر“ کے لیے اجر کی دعا کی تھی اور رخصتی کے بعد اس گھر میں پہلی نماز کے دوران بھی جب اس نے سالار کے لیے اپنے دل میں محبت پیدا ہونے کی دعا کی تھی وہ اسے یاد آتا تھا یا یاد رہتا تھا۔
دن کی کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی تھی جب وہ سالار کے لیے اللہ سے نعمتوں اور اجر کی طالب نہیں ہوتی تھی، تب بھی جب وہ اس سے شاک یا خفا ہوتی تھی۔ وہ اللہ کے بعد اس دنیا میں واقعی اس کا ”آخری سہارا“ تھا اور ”سہارے“ کا ”مطلب“ اور ”اہمیت“ کوئی امام سے پوچھتا۔



”آریو شیو۔۔۔ تم اس لیے رہ لو گی؟“ سالار اب بھی جیسے یقین دہانی چاہتا تھا۔
وہ وہ ہفتوں کے لیے نیویارک اپنے نیک کی کسی ورکشاپ کے سسٹم میں جا رہا تھا اور امام اس بار اپارٹمنٹ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ عام طور پر سالار گراچی یا ممبئی اور جاتے ہوئے اسے سعیدہ اماں یا فاخر سید علی کے ہاں چھوڑ جایا کرتا تھا، لیکن اس بار وہ بغداد تھی کہ وہ وہیں رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ وہاں اگلی رہ سکتی ہے۔
”میں رہ لوں گی۔۔۔ ویسے بھی فخر قن بھائی اور بھائی تو پاس ہی ہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے سالار کو تسلی دی۔ اس کی فلاسٹک صحنہ گیارہ بجے تھی اور وہ اس وقت پیکنگ سے فارغ ہوا تھا۔
”میرے بغیر رہ لو گی تم؟“ اس نے امام کی بات سننے کے بعد کہا۔ وہ اب اپنے بریف کیس میں کچھ چیز رکھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ وہی ہفتوں کی تو بات ہے۔“ امام نے بے حد اطمینان سے اسے کہا۔
”وہ ہفتوں میں چند دن ہوتے ہیں۔“ سالار نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔
”تو کوئی بات تمہیں گزر جائیں گے۔“
سالار نے کمراساس لیا۔ ”ہاں تمہارے تو گزر جائیں گے۔ میرے نہیں گزریں گے“ میں تو ابھی سے تمہیں مس کرنے لگا ہوں یار۔“ وہ ہنس پڑی۔
”پہلے بھی تو جاتے ہو تم۔۔۔ دو ہفتے پہلے وہی گئے تھے۔ پھر پچھلے مہینے سنگا پور۔“ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔

”وہ دن کے لیے وہی گیا تھا اور چار دن کے لیے سنگا پور۔ یہ تو دو ہفتے ہیں۔“
”ہاں تو دو ہفتے ہی ہیں تاہم مہینے یا دو سال تو نہیں ہیں۔“ اس نے کمال اطمینان کے ساتھ کہا۔
سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔
”چلو اچھا ہے یہ بھی۔۔۔ نہ میں یاد آؤں گا نہ نظر آؤں گا۔ نہ میرا کوئی کام ہو گا وقت ہی وقت ہو گا تمہارے پاس۔“ وہ نجانے اس سے کیا سننا چاہتا تھا۔
”ہاں کافی وقت ہو گا میں ایک دوپٹہ منگھڑ مکمل کروں گی۔ گھر کے کچھ اور کام ہیں وہ بھی کروں گی۔ سعیدہ اماں کے بھی ایک دو کام ہیں وہ بھی منٹاؤں گی۔ میں نے بہت کچھ پلان کیا ہوا ہے۔“
اس نے ناول پکڑے، اپنی تمامای روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس پڑا تھا۔
”تمہارے لیے تو blessing in disguise ہو گیا ہے میرا رب“ میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا میری وجہ سے تمہارے اتنے کام پینڈنگ ہو رہے ہیں۔“

اگر اس کے لیے میں کد تھا تو امامہ نے نوٹس نہیں کیا۔

”چلو یہ بھی اچھا ہے۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”وہ بڑا لگا ہوا تو میں تمہیں لے جاتا۔“ اسے پھر کچھ خیال آیا تھا۔

”تم پریشان مت ہو میں یہاں پر بالکل ٹھیک رہوں گی۔“ امامہ نے فوراً سے پشتر کہا۔

سالار جواب دینے کے بجائے جب چاہا اسے دیکھتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ امامہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”تمہارا اطمینان۔“

”میں قلمی ہیرو کنز کی طرح ڈانڈلاگ نہیں ہول سکتی۔“

”صرف قلمی ہیرو کنز ہی ڈانڈلاگ بولتی ہیں؟“

”نہیں ہیرو بھی بولتے ہیں۔“ وہ اطمینان سے ہنسی۔ سالار مسکرایا تک نہیں تھا۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

”مت چاؤ پھر۔“ اگر اتنا مس کر رہے ہو تو۔“ اس نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

”پیارے کتھیں تو نہ جاتا لیکن میں تمہارا کوئی چیلنج قبول نہیں کروں گا۔ مجھے تم سے بارنا پسند ہے۔“ وہ ہنسی۔

”تم بات بدل رہے ہو؟“

”نہیں، خود کو تسلی دے رہا ہوں۔ چلو آؤ! تمہیں کافی پلو اکراؤں۔“

وہ ایک دم بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”اس وقت۔“؟ رات کو اس وقت امامہ تیار نہیں تھی۔

”ہاں۔ اتنے دن تک تو میں پلو اسکول کا کافی۔“ وہ دراز سے والٹ اور کاری چابیاں نکال رہا تھا۔

”لیکن اب میں پھر کپڑے بدلوں۔“؟

”مت بدلنو چادر لے لو۔ یہی ٹھیک ہے۔“

سالار نے اس کی بات کافی۔ وہ اب سیل فون اٹھا رہا تھا۔

فورٹریس سے کافی مینے کے بعد وہ اسٹینڈیم کے گرد بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔

”اب گھر چلیں، تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ امامہ کو اچانک خیال آیا۔

”میں پلین میں آرام کروں گا۔“

امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا سنجیدہ اور کسی گہری سوچ میں کیوں ڈوبا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے

راستے میں ایک دکان سے بہت سا پھل خریدا۔

”تم یہاں نہیں ہو گے تو اتنا پھل خریدا کی کیا ضرورت ہے؟“ امامہ حیران ہوئی تھی۔

”تمہارے لیے خریدا ہے شاید پھل کھاتے ہوئے ہی میں تمہیں یاد آجاؤں۔“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”پھل کھانے کے لیے شرط ہے۔“ وہ بے اختیار ہنسی۔

”تمہیں امید۔“ امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

واقعی اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہفتے کا ٹریپ اتنا لمبا تو نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کی اداسی کا اظہار کیا جائے۔

کم از کم سالار سے وہ اس طرح کی جذباتیت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔



اسے واقعی سالار کے جانے کے بعد پہلے دو دن کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ معمول کے کام کرتی رہی۔ اس نے

نامکمل تصویروں پر کام شروع کیا اور ساتھ ہی ایک بنانا دل بھی شروع کر دیا۔

سالار کی عدم موجودگی میں رات کا کھانا وہ فرقان کے ہاں کھایا کرتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اطمینان سے ان کے ہاں کھانا کھانے اور کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد گھر واپس آجاتی، پھر کوئی ناول لیتی اور سونے تک پڑھتی رہتی، لیکن مسئلہ تیسری رات کو ہوا تھا۔ اس دن سالار نے اسے دن بھر کال نہیں کی تھی اور اتنے مہینوں میں وہ پہلا دن تھا جب ان کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف سے نہ میسج نہ کال اور نہ ہی کوئی ای میل آئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے بہت مصروف تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید اگلے چند دن وہ اس سے بات نہ کر سکے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد سالار سے اس کی صرف پانچ منٹ کے لیے بات ہوئی تھی، لیکن پچھلے دو دن وہ دو قصہ قدے سے مختصر ہی سہی اس کو ای میلز بھیجتا رہا تھا اور اب وہ بھی یکدم آئینہ ہو گئی تھی۔

وہ اس رات فرقان کے ہاں کھانے پر نہیں گئی، اس کی بجوک جانب ہو گئی تھی۔ اس نے اس دن کمپیوٹر مسلسل کن رکھا ہوا تھا، اس میں کہ شاید وہ اسے ای میل کرے، حالانکہ وہ دور کشاپ کے دوران اسے ای میل نہیں کرتا تھا۔

رات کو اس نے کافی کے لیے کریم نکالنے کے لیے فریج کھولا تو اس نے ٹیک کا وہ ٹکڑا دیکھا جو دو دن پہلے وہ اریورٹ جانے سے پہلے کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا اور امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ٹیک کا وہ بچا ہوا ٹکڑا فریج میں کیوں رکھ چھوڑا تھا۔ نہ صرف وہ ٹکڑا، بلکہ وہ کین بھی جس میں بچا ہوا جوس تھا۔ کچھ دیر وہ ان دونوں چیزوں کو دیکھتی رہی، پھر اس نے فریج بند کر دیا۔

کافی بنا کر وہ میسر پر نکل آئی تھی جہاں دو ٹیک اینڈرپ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔

منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سرخ اینٹوں کی اس منڈیر پر دو مگنڈ کے نشان دیکھے تھے۔ ایک ذرا گہرا، دوسرا بہت ہلکا۔ دو رات کو اکثر یہاں کھڑے، نیچے دیکھتے ہوئے کئی بار میٹیں پر اپنے مگنڈ رکھ دیا کرتے تھے۔ نیچے بلند ٹنگ کے لان میں کچھ نیچے اور لوگ چل قدمی کر رہے تھے۔

”تمہیں نیچے اچھے لگتے ہیں؟“ اس نے ایک دن وہاں کھڑے نیچے کھیلنے اور شور مچاتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ لیکن اس طرح کے نہیں۔“ اس نے جواباً چائے پیتے ہوئے اپنے کندھے اچکا کر گم سے ان بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہنس پڑی۔ اس کا اشارہ شور کی طرف تھا۔

”مجھے تو ہر طرح کے بچے اچھے لگتے ہیں۔ شور کرنے والے بھی۔“ اس نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

Good for you but

I can't stand them

سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”دوسروں کے نیچے ہیں، اس لیے شور کرتے ہوئے برے لگتے ہیں۔ اپنے بچوں کا شور کبھی برا نہیں لگے گا تمہیں۔“ اس نے روایتی سے کہا۔

”نیچے؟ ایک بچہ کافی ہے۔“ وہ چائے پیتے پیتے انکا۔

امامہ نے کچھ چونک کر نیچے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ایک کیوں؟“

”تو جانتے ہوئے چاہیں؟“ وہ خمیدہ ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔

”کس سے کم چار۔“
 ”اور زیادہ سے زیادہ بارہ۔“ سالار نے جتے ہوئے اس کے جملے میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اسے مذاق سمجھاتا تھا۔
 ”میں سیکس ہوں۔“ اس کی ہنسی رکھنے پر اس نے کہا۔
 ”چار بچے۔ تم حواسوں میں ہو۔“ سالار نے مک منڈیر پر رکھ دیا۔
 ”کون پالے گا انہیں؟“ اس سے بے اختیار تشویش ہوئی۔
 ”تم اور میں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔
 ”میں ایک بچہ پال سکتا ہوں چار نہیں۔“
 سالار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے ”حتمی انداز میں“ کہا۔
 ”ٹھیک ہے تم ایک پال لیتا تین میں پال لوں گی۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر دوبارہ نیچے جھانکنے لگی۔
 ”امامہ! میں سنجیدہ ہوں۔“

”اور میں بھی۔“
 ”ہم چار بچے انور نہیں کر سکتے۔“ اسے لگا کہ اسے امامہ کو منطقی انداز میں سمجھانا چاہیے۔
 ”میں تو کر سکتی ہوں۔“ میرے پاس وہ بیٹھے ہیں جو۔“
 ”وہ میں نے اس لیے نہیں دیے کہ تم انہیں بچوں کی فوج پر انوسٹ کرو۔“ سالار نے جھنجھلا کر اس کی بات کافی۔
 امامہ کو برا لگا۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے بے حد فحشی کے عالم میں بھرپور دیکھنے لگی تھی۔

”سویتھ ہارٹ! ہم کو۔“ سالار نے اس کے کندھے کے گرد ہاتھ بچھلا کر اسے منانے کی کوشش کی تھی۔
 ”ہاتھ ہٹاؤ۔“ امامہ نے اس کا ہاتھ جھکا۔
 ”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ جھنجھلا دیا۔ ”تم چاہتی ہو میں گھر، آفس، اسکول، ڈاکٹرز اور مارکیٹوں کے چکر لگاتے لگاتے بوڑھا ہو جاؤں۔“

”تو تم کیا کرتے ہوئے بوڑھا ہونا چاہتے ہو؟“ تڑ سے جواب آیا تھا، وہ لا جواب ہو گیا۔ وہ فحشی بھری سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ رات کے وقت اپنے بچوں کو گھر میں کیوں نہیں رکھتے، دوسروں کو دکھانے کے لیے باہر کیوں لے آتے ہیں۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر منڈیر سے اپنا منگ اٹھا کچھ جھنجھلا ہٹ کے عالم میں اندر چلا گیا تھا۔ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

وہ اب بھی ہنس پڑی تھی۔ منڈیر کے اس نشان کو دیکھتے ہوئے نجات کیا کیا یاد آیا تھا۔ نیچے لان میں پھر وہی شور مچا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے اس رنگ کو دیکھا جس پر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کبھی کبھار بیٹھ کر گٹھار بچایا کرتا تھا۔ اسے اس کے گٹھار میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ گٹھار بجاتے ہوئے وہ خود نہیں بولتا تھا، صرف اس کی باتیں سناتا رہتا اور وہ میکانیکی انداز میں وقفے وقفے سے اس کے منہ میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ڈال کرتی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور گٹھار پر باری باری اپنا پسند کی کوئی شے بجاتا رہتا یا اپنے۔ انشور و منٹس کو نکال کر ان کی صفائی کرتا رہتا۔ یہ دیکھا بیٹھ کر اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

اسے احساس نہیں ہوا کہ کافی کام ہاتھ میں لیے اس رگ کو دیکھتے اس کی کافی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ اسی طرح بھرا ہوا منگ بے گرو ایس اندر آئی۔

بعض دفعہ مجھ میں ہم کسی کو کیوں یاد کرتے ہیں۔ یاد کرتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے۔ یاد آتا ہے تو یاد کرتے ہیں۔؟ ہاں یہ معہ کہاں حل کرپاتا ہے۔



فجر کے بعد وہ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کال نہیں تو کوئی ای میل سی۔ اس نے وقفہ وقفہ سے اسے چارپانچ ای میلز کی تھیں پھر وہ مایوس ہو گئی۔ جواب نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ ای میلز چیک نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن اداسی کا دورہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ اس دن وہ بینٹنگ کر سکی نہ کوئی کتاب پڑھ سکی اور اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ فریج میں چھپے چند دنوں کا رازا ہوا کھانا کھالیا۔ شام تک وہ اگلے دن سعیدہ املاں کے ہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ تمنا کی تھی جو اسے مطمئن کر رہی ہے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ نو سال تنہا ہی رہی تھی۔ اس سے زیادہ تنہا اس سے زیادہ برے حالات میں۔

اس دن اسے سالار کی تین لائنوں کی ایک ای میل ملی تھی اور ان تین لائنوں کو اس نے رات تک کم از کم تین سو بار پڑھا تھا۔

"Hi Sweet heart! How are you? This work shop has really nailed me down! How is your painting going? Love you."

"بائی سویٹ ہارٹ!"

کیا حال ہے؟ اس ورک شاپ نے تو مجھے جکڑ لیا ہے۔ تمہاری بینٹنگ کیسی چل رہی ہیں ٹوبو۔"

ان تین جملوں کی ایک میل کے جواب میں اس نے اسے ایک لمبی ای میل کی گئی جس میں اسے اپنی ہر ایک نوبی بتائی تھی۔ ایک کے بعد دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ۔ وہ اس سے یہ کہے کہ وہ بتی کہ وہ اداس ہے پھر وہ جب پوچھتا تو اسے وہ اپنی اداسی کی کیا وجہ بتاتی۔؟



"بیٹا! چہو کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟ کوئی پریشانی ہے۔؟ جھگڑا کر کے تو نہیں گیا سالار تمہارے ساتھ؟" سعیدہ املاں نے اس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی انہیں سوائل سے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ بری طرح متھکر ہوئی تھیں۔

"نہیں! میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ایسے ہی گھر میں اکیلی تھی مثلاً اس لیے۔"

اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بتلایا لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔

امامہ نے کپڑوں کا ایک کمرے میں رکھنے کے فوراً بعد ڈرننگ روم کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پانچ دنوں میں پہلی بار اس نے اپنے عکس پر غور کیا تھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ سعیدہ املاں اگر پریشان ہوتی تھیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کوئی بھی اس کا چہرہ آسانی سے چھ سکتا تھا۔

اگلے دس منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے چہرے کے اعصاب اور تاثرات کو ریلیکس کرنے کی پریکٹس کرتی رہی۔ مسکرا کر ہنسنے کے تاثرات کو نرم رکھ کر پھر جیسے نج ہو کر اس نے فکسٹ مان ملی۔

"جنم میں جائے اب گنتی ہوں پریشان تو میں کیا کروں۔؟ کتنا مسکراؤں میں۔؟"

پھر وہ باہر نکل آئی۔ سونا وہاں بھی مشکل تھا اور اداسی یہاں بھی ویسی ہی تھی۔

"اتنی چپ تم پہلے تو کبھی نہیں رہیں بیٹا! اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟" اگلی شام تک سعیدہ اماں حقیقتاً فکر مند ہو چکی تھیں، حالانکہ اس دن صبح سالار سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

"تم سالار کے ساتھ خوش تو ہوتا؟" وہ تشویش سے پوچھ رہی تھیں اور وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اداسی بری طرح بڑھی تھی۔ مسئلہ خوشی کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔ بات صرف اس کے ساتھ رہنے کی تھی۔ خوش یا اداس جیسے بھی لیکن اس کے ساتھ ہی۔

اس نے سعیدہ اماں کو جواب دینے کے بجائے موضوع بدل دیا تھا۔ دو دن وہاں رہ کر وہ پھر اسی بے چینی کے عالم میں واپس آئی تھی۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے آنے تک وہیں رہو گی؟" سالار اس کی واپسی پر حیران ہوا تھا۔

"میری مرضی۔" وہ کچھ اور کرنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

"اوکے۔۔۔" وہ جواب پر حیران ہوا تھا، لیکن اس نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔

"مجھے نیو یارک سے ورت گشاپ کے ختم ہونے کے بعد ہمیں سے دو ہفتے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔"

سالار نے اسے اگلی خبر سنائی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا مطلب؟"

"جو کوئیگ مائٹریال والی کانفرنس انینڈ کر رہا تھا" اسے کوئی میڈیکل ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر مجھے کانفرنس میں جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ویرا بھی ہے اور میں قریب بھی ہوں۔"

وہ صدمے سے بول ہی نہیں سکی۔ دو ہفتے اور باہر ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ وہ عید کے ایک ہفتے کے بعد واپس پاکستان آئے۔

"ہیلو! سالار نے اس کی لمبی خاموشی پر لائن پر اس کی موجودگی چیک کی۔

"یعنی عید کے بعد آؤ گے تم؟"

اس نے اپنے لمبے کی مایوسی پر قابو کرتے ہوئے سالار کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ عید قریب ہے۔

"ہاں۔" ایک حرفی جواب آیا۔ یقیناً اسے یاد تھا۔

"اور میں عید پر کیا کروں گی؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ مایوسی کی انتہا تھی جس کا وہ اس وقت شکار ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ کا انتظار تین ہفتوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور تین ہفتوں کے لیے اس اپارٹمنٹ میں اکیلے رہنا۔

اسے سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم اسلام آباد چلی جانا عید پر۔" سالار نے کہا۔

"نہیں میں یہیں رہوں گی۔" اس نے بلاوجہ ضد کی۔

"تم ٹھیک ہے یہیں رہو لیکن۔" سالار نے باسانی ٹھٹھے نیک دیے۔

"تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں۔؟" بھیجنا تھا تو پہلے کرنا چاہیے تھا انہیں۔"

اسے اب ہینک والوں پر غصہ آ رہا تھا۔

"ایسی ایمرجنسی ہو جاتی ہے کبھی گھمساؤ کسی اور کو اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان سے نہیں بھیج سکتے ورنہ مجھے کہاں بھیجنا تھا انہوں نے۔" سالار نے وضاحت کی۔

"پھر بھی۔ تم کہہ دو گے کہ تم مصروف ہو، تمہیں ان دنوں پاکستان میں کچھ کام ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ میں جھوٹ بولتا۔؟"

امامہ کو غصہ آگیا۔ ”زندگی میں بھی جھوٹ نہیں بولا کیا؟“
 ”نیور اپنے کام میں؟ ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ امامہ کچھ بول نہیں سکی۔
 ”تم ایسا کرو، ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ اسے دن اکیلے رہو گی تو پورہ جھاؤ گی۔“
 اس نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں میں پور نہیں ہوں گی۔ مجھے یہاں بڑے کام ہیں۔“ وہ اس کے مشورے پر کچھ حسد نہ لے سکی۔
 سالار کو اس کی ٹون نے حیران کیا تھا۔ وہ اس طرح کبھی بات نہیں کرتی تھی، مگر ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ بے حد خوشگوار اور بوجوش انداز میں اس سے باتیں کر رہی تھی پھر یک دم اسے کیا ہوا تھا۔ کم از کم وہ یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کے کینیڈا میں مزید رہنے کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہو رہی ہے۔ وہ امامہ سے پوچھنا چاہتا تھا، لیکن فوری طور پر اس نے موضوع کو بدلتا ہوا بستر سمجھا۔

اپ سیٹ شاید ایک بہت چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے، جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے حد غم اور غصے میں تھی۔ اسے یہ ”ایکسٹینشن“ دھوکا لگ رہا تھا۔ آخر وہ اسے چار ہفتے کا کہہ کر تو باہر نہیں گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر چار ہفتے کا بھی کہہ کر جاتا تو اسے کیا اعتراض ہوتا تھا اس نے تب بھی اسے اسی طرح خوشی خوشی

روانہ کر دیتا تھا یہ اندازہ لگائے بغیر کہ وہ بعد میں ان تیس دنوں کے ایک ایک گھنٹے کو گننے کی۔

”میں بھی اب اسے اسی میل نہیں کروں گی، نہ ہی کال کروں گی، نہ ہی اس سے پوچھوں گی کہ اسے کب آتا ہے اور کب نہیں۔ آتا ہے تو آئے، نہیں تو نہ آئے، چشم میں جائے، میرا ہی قصور ہے۔ بار بار اس سے نہ پوچھتی تو وہ اس طرح نہ کرتا۔“

اس رات بستر میں لیٹے ہوئے وہ بے حد رنجیدگی کے عالم میں ان تمام چیزوں کی فہرست بناتی رہی جن میں اب اسے سالار کی نافرمانی کرنی تھی۔ بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اس کی فہرست ابھی دو سو پچیس اینٹوں تک پہنچی تھی کہ اسے بیڈ کے بالکل اوپر چھت پر چھپکی نظر آئی۔ وہ انٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکیلا گھر اور چھپکی یہ فی الحال اس کے لیے بدترین تھا۔ وہ چھپکی کو دیکھتے ہی بیڈ سے انٹھ کر صوفے پر چلی گئی اور اسے پھر سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔ ایک چھپکی سی چھپکی وہ ہفتے پہلے اپارٹمنٹ میں نمودار ہوئی تھی اور وہ بھی سیدھا ان کے بیڈ روم میں۔ شاید کسی دن ٹیرس کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اندر آگئی تھی۔

وہ اس وقت بیڈ سائیڈ ٹیبل لیسٹ تن کے رات کو ناول پڑھ رہی تھی، جو بے حد دلچسپ موز پر تھا، جب بستر میں نیم دراز اپنی ٹانگیں سکڑے ہوئے اس کی نظر اس اچانک چھت پر اپنے بیڈ کے بالکل اوپر موجود چھپکی پر پڑی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ وہم لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹ تن کر کے دیکھا، وہ چھپکی ہی تھی۔ سالار برابر والے بستر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ عام حالات میں بھی اسے نہ جگاتی، لیکن یہ عام حالات نہیں تھے اس نے اوندھے لیٹے ہوئے سالار کا کندھا جھنجھوڑا۔

”سالار۔ سالار۔“ وہ اس کی آواز پر نیند میں ہلکا ہوا گیا۔

”کیا ہوا؟“

”وہ اوپر دیکھو، میرے بیڈ کے اوپر چھت پر چھپکی ہے۔“

امامہ نے حواس باختہ ہو کر اسے کہا۔ سالار نے موندی ہوئی آنکھوں کو مسلے، لیٹے لیٹے ایک نظر چھت کو دیکھا،

پھر امامہ کو اور دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔

”سالار! امامہ نے دوبارہ اس کا کندھا ہلایا۔

اس کا خیال تھا شاید وہ نیند میں اس چھپکی کو دیکھ نہیں پایا۔

”دیکھنا ہے میں نے امامہ سونے۔“ وہ لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔
 ”دیکھنا ہے تو کچھ کرو اس کا۔“ وہ اس کی بے توجہی پر ناراض ہوئی۔
 ”چل جائے گی خود ہی۔“ تھلاٹ آف کر کے سو جاؤ۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔
 ”میں لیٹے سوؤں۔؟“ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔“ اس کی خفگی بڑھی۔
 ”لائٹ بند کرو نہ تم اسے دیکھو نہ وہ تمہیں دیکھے۔“
 اسے اس کے مشورے سے زیادہ اس کی بے بسی پر غصہ آیا۔
 ”تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے؟“
 ”میں رات کے اڑھائی بجے چھپکلی نہیں مار سکتا۔ جسٹا انور اٹ۔“
 ”میں نہیں انور کر سکتی اسے۔ اگر کرے تو سیدھا میری ٹانگوں پر کرے گی۔“
 اس نے چھت کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ وہ واقعی اس کی ٹانگوں پر ہی گرتی۔
 ”یار میں تمہاری سائیڈ پر آجاتا ہوں تم میری سائیڈ پر آجاؤ۔“
 وہ کروٹ لیتے لگتا ہوا اسی طرح اس کی سائیڈ پر چلا گیا۔ وہ اس کے ایثار سے زیادہ اس کی دلیری سے متاثر ہوئی
 تھی۔ کمرے کی بڑی لائٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے وہ اپنا ٹول لیے سالار کا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ کن کر کے اس کے
 بستر میں بیٹھ گئی۔ سالار تب تک اسی طرح اونڈھے منہ لیٹے لیٹے اس کا سائیڈ لیمپ آف کر چکا تھا۔ خود کو قدرے
 محفوظ جانتے ہوئے کچھ پرسکون انداز میں اس نے ٹول کے چند جملے پڑھے پھر دوبارہ چھپکلی کو دیکھا۔ وہ جیسے اسی
 جگہ پر چپک کر رہ گئی تھی۔ امامہ نے سالار کو دیکھا۔ وہ اس چھپکلی کے عین نیچے بے حد اطمینان سے اسی طرح کھیل
 اوڑھے اونڈھے منہ لیٹا تھا۔

”سالار تم مرد کتنے بہادر ہوتے ہو۔“ اس نے مردوں کو سراہنا ضروری سمجھا۔

”اور سمجھ دار بھی۔“ اسے جواباً ”بڑبڑا ہٹ مٹائی دی۔“

”سمجھ دار کیسے؟“ وہ صفحے پلٹتے پلٹتے چونکی۔

”چھپکلی گرتی تمہارے بیڈ پر، لیکن بھانسی میرے بیڈ کی طرف۔ اس کا منہ میرے بیڈ کی طرف ہے۔“ بھابی
 لیتے اسی طرح آنکھیں بند کیے سالار نے سردھے ہوتے ہوئے کہا۔
 امامہ نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈ سے باہر تھی۔ چھپکلی کا سر واقعی سالار کے بیڈ کی طرف
 تھا۔

”تم سارے مرد بے حد خود غرض ہوتے ہو اور ایک جیسے ہوتے ہو۔“

وہ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے، جسٹی پلنڈ آواز میں۔ اس سے کہہ سکتی تھی اس نے کہا۔

سالار نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا، لیکن اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ تنگ کرنے
 کے لیے یہ موقع شاید غلط ہے۔

دس منٹ کے بعد اسے چھپکلی کا صفایا کرنے کی اطلاع دے کر وہ اسے منار کلاؤنچ سے واپس لے گیا تھا۔ اس
 نے اگلے کئی دن یہ چھپکلی نہیں دیکھی تھی اور آج یہ چھپکلی پھر آگئی تھی۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا تھا اس نے اس
 چھپکلی کو نہیں مارا تھا۔ وہ احقان بات اس وقت اس کے لیے ایک اور پرائنٹ ہو گیا تھا۔

اگلے دن فون پر اس نے سالار کو اس چھپکلی کے دوبارہ نمودار ہونے کے بارے میں بتایا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم نے اسے مار دیا تھا۔“ اس نے چھوٹے ہی سالار سے کہا۔

”میں نے اسے واقعی مار دیا تھا، یہ کوئی اور چھپکلی ہوگی۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں سو رہی چھپکلی تھی، تم نے اگر اسے مارا ہو تو تم مجھے دکھاتے۔“ وہ اپنی بات پر مصر تھی۔
 سالار کا سر جھوم کر وہ امامہ سے اس سے زیادہ احمقانہ گفتگو کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔
 ”تم اگر کہیں نہیں تمہیں وہ مری ہوئی چھپکلی بھی دکھاؤ۔“ اس نے محل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”نہیں یہ وہی تھی میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”اگر یہ وہی تھی تو اتنے دن سے کہاں تھی؟“
 اس نے ایک آلہ بیکل چیز لا کر دیکھ دینے کی کوشش کی۔
 ”جہاں بھی تھی مجھے نہیں بتا، لیکن تم کی چاہتے تھے کہ میں پریشان ہوں۔“
 سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا، وہ اس الزام کے جواب میں کیا کہتا۔ امامہ کو کچھ ہوا تھا، لیکن کیا ہوا تھا۔ یہ اسے سمجھ میں نہیں آیا۔

”تمہیں بتا ہے مجھے چھپکلی سے ڈر لگتا ہے، لیکن تم پھر بھی اسے یہاں بھجوا کر گئے، کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے میرا تم مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہو، تمہارے لیے ہر چیز مذاق ہے۔“ اس کی کسی بات کا کوئی سرچر نہیں تھا۔ کم از کم سالار نہیں ڈھونڈ سکا لیکن وہ اس کی ”گفتگو“ مستنابا۔

”تم ہمیشہ میرے ساتھ اس طرح کرتے ہو اور مجھے بتا ہے، تم نے عیث اس طرح کرنا ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے صرف تمہاری اپنی اہمیت ہے اور میں تمہارے گھر کی نوکرائی ہوں یا پاؤں کبیر۔ تم جہاں مرضی بھجو، لیکن میں ہمیشہ گھر رہوں، جیسے غلام رہتے ہیں۔ میں سارا دن کام کروں اور تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔“ وہ اس بے رابطہ گفتگو کے اختتام پر ہنسیوں سے رو رہی تھی۔

سالار گفتگو میں ایڈو کیا تھا چھپکلی کا نہ مارا جاتا۔ اس کی خود غرضی اس کا گھر پر نہ ہونا یا گھر کے وہ کام جو اسے کرنے پڑے تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ اسے سے زیادہ تک جانے والی گفتگو میں تھی۔ X سے 3 تک جانے والی گفتگو تھی جس کو سمجھنے کے لیے جس قدر موملے کی ضرورت تھی، وہی الحال سالار کو نہیں آتا تھا۔
 اگلے پانچ منٹ وہ بے حد قفل سے اس کی ہنسیوں کے ٹھنڈے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب بالآخر طوفان کچھ تھماتا اس نے کہا۔

”آئی ایم سوری، میرا قصور ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں، ملازم کو بھیجے، وہ چھپکلی کو مار دے گا۔“ فی الحال معذرت کے علاوہ اسے اس صورت حال سے نپٹنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا۔
 ”نہیں، آپ میں چھپکلی کے ساتھ رہوں گی تاکہ تمہیں بتا چلے۔“ اس نے ناگہر کرتے ہوئے اسے کہا۔

سالار کو بے اختیار ہنسی آئی اور اس نے کھانسی کر اس ہنسی پر قابو پایا۔ وہ جلتی پر قفل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ امامہ کا مسئلہ کیا تھا، وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا، لیکن وہ حیران تھا اگر یہ موزوں گزرتے تو یہ بدترین قسم کے تھے اور اگر یہ tantrums تھے تو سمجھ میں نہ آنے والے، لیکن پاکستان سے اتنی دور بیٹھے وہ سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

فرقان کے ملازم نے اگر اس دن وہ چھپکلی ماری تھی، لیکن اس چیز نے بھی امامہ کے دل میں کسی ممنونیت کو پیدا نہیں کیا تھا۔
 اگلے دن کھانا پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر چھری سے کٹ لگ گیا۔ سنگ میں پانی کے نیچے انگلی رکھے اسے پھر دیا د آنے لگا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“

وہ اس دن آفس سے آنے کے بعد لاؤنج میں ٹھلٹے ہوئے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ امامہ ڈنر کے لیے

برتن لگا رہی تھی۔ وہ بات کرتے ملتے ہوئے، لیکن کاغذ پر پڑے پالے سے کچھ ہنر کھا رہا تھا جب امامہ نے آکر وہاں رکھ چاہا اٹھا۔ سالار نے اس کے ہاتھ کی پشت پر چند آبلے دیکھے۔ فون پر بات سنتے سنتے اس نے بے اختیار اس سے کہا ”یہ کیا ہوا؟“

”یہ...؟“ امامہ نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنا ہاتھ دیکھا۔

”کچھ نہیں، کھانا بنا رہی تھی تو آئل کے کچھ جھینے گر گئے۔“ اس نے لاہروائی سے بتایا۔

وہ اسی طرح فون پر بات سنتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اسی طرح فون پر بات کرتے لاؤنج سے غائب ہو گیا۔ وہ فریج سے پانی نکال رہی تھی، جب دوبارہ نمودار ہوا۔ اسی طرح فون پر اشاک مارکیٹ کے کسی ایڈیٹر پر بات کرتے ہوئے اس نے امامہ کا ہاتھ پکڑ کر چند لمحوں میں اس پر مرہم لگایا اور پھر اسی طرح دوبارہ چلا گیا۔ وہ ٹل نہیں سکی تھی۔ اتنے سالوں میں اس کے کسی زخم پر رکھا جانے والا وہ پہلا مرہم تھا۔ وہ اتنے سالوں میں شاید بے جس ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور چوٹیوں پر رونے اور ان کی پروا کرنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کسی زخم کو مندل کرنے کے لیے بھی کچھ کیا جاتا تھا۔ مرہم دوسرے رکھتے ہیں اور اس کی زندگی میں کوئی دوسرا رہا ہی نہیں تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے سالار کی نظر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس نے قدرے تنگی کے عالم میں اس سے کہا۔

”اگر اسی وقت ہاتھ پر کچھ لگالیتیں تو یہ آبلے نہ پڑتے۔“

”مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی۔“

”مگر مجھے تکلیف ہو رہی ہے سویتھ بارث!“

وہ اس سے نظریں ملا کر جواب نہیں دے سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہوگی اور اس مرہم سے زیادہ ٹھنڈک اس کے اس جملے نے پہنچائی تھی اسے تو اب کوئی تھا جسے اس کے ہاتھ پر آنے والے ایک معمولی زخم پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔

اس کے ہاتھ پر چھوٹے موٹے زخموں کے کئی نشان تھے۔ وہ ان میں سے ان زخموں کو بڑی آسانی سے پہچان سکتی تھی، جو اس گھر میں آنے کے بعد لگے تھے۔ ان زخموں میں اسے تکلیف ہوئی تھی اور یہ تکلیف اس لیے ہوئی تھی، کیونکہ ہر بار کسی نے بڑے پیار سے ان پر کچھ لگایا تھا یا لگا کر کہا تھا۔

جیل، مرہم، پلاسٹ، اسپرٹ، اینٹی سسٹک کریم۔ وہ درد کے احساس سے جیسے دوبارہ آشنا ہو رہی تھی اور اب اتنے میچوں کے بعد یہ پلاسٹ تھا جس کے بارے میں اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں تھا اور اسے وہ ”پوچھنے والا“ ایک بار پھر بری طرح یاد آیا تھا۔

”دوسرے بچنے کے اختتام تک وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بری طرح جھنجھانے لگی تھی۔ ملازمہ کے ساتھ مالی کے ساتھ اس گھر میں آنے والے فرقان کے بچوں کے ساتھ اور خود سالار کے ساتھ۔“

”امامہ! کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ سالار کو بالآخر اس سے بہت ڈائریکٹ ہو کر پوچھنا پڑا تھا۔

”کیا ہوتا ہے مجھے؟“ وہ اس کے سوال پر بری طرح جڑی۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں میں۔“ اس نے محل سے کہا۔

”کچھ نہیں ہو رہا مجھے۔“

”پھر تمہارے وہ بات کرنے کرتے رک گیا۔ یہ کمنا ذرا مشکل تھا کہ وہ اس کے ساتھ تلخ ہو رہی تھی۔“

”بھر میں کیا؟“ امام نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”کچھ نہیں، میں ابھی دو تین دن تک تم کو فون نہیں کر سکوں گا۔“

”کیوں؟“ وہ بری طرح ہجڑی۔ ”اتنا بھی کیا کام ہے کہ تم مجھے چند منٹ کے لیے بھی کال نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہیں ای میل کر دیا کروں گا اگر وقت ملا تو کال بھی کر لوں گا۔۔۔ لیکن شاید نہ کر سکوں۔“ وہ قہقہے سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”تم ای میل بھی نہ کرو مجھے اس سے اور بھی وقت بچے گا تمہارا۔“

اس نے بے حد فحش کے عالم میں فون بند کر دیا۔ اسے سالار پر بری طرح غصہ آ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ وہ کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ریسیو کرنا پڑی۔

”تم نے فون بند کیا تھا؟“ وہ دوسری طرف حیرانی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔“

”کیوں؟“

”تاکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے کل ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ جن مردوں کو احساس کمتری ہوتا ہے،

وہ اپنی بیویوں کو اپنی مصروفیات کے قصے سناتے رہتے ہیں۔“ سالار نے کچھ ہکا بکا ہو کر اس کا جملہ سنا تھا۔

اسے اس بات کا کوئی سرسبز سمجھ میں نہیں آیا۔ ”تاکہ ان کی بیویوں کو یہ امپریشن ملے کہ وہ دست اہم ہیں اور دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی۔“ سالار نے اسی اچھے میں اس کے بانی جملے بھی سنے تھے۔ ”اس سے ان کی esteem

self بڑھتی ہے۔“

اس نے آخری جملہ کہہ کر کچھ دیر سالار کے رد عمل کا انتظار کیا۔ وہ خاموش تھا۔

”ہیلو۔“ امام کو غصہ نہ ہوا کہ شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔

”میں سن رہا ہوں اس میگزین میں بس اتنا ہی لکھا تھا؟“

وہ سنجیدہ لگ رہا تھا لیکن بات سنجیدہ نہیں تھی۔

”ہاں۔۔۔“

”لٹل ڈیٹیلز کس پاس مکی تھیں تم؟“ اس نے کسی رد عمل کا اظہار کیے بغیر بات بدلی تھی۔

امام کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی وہ اس سے بحث کرنا چاہتی تھی۔

وہ گھٹنے کے بعد اس نے ان وہ منتوں پر پروگرام چارٹ اسے ای میل کر دیا۔ کافر نس کی اگر گناہنگ باؤی کی

طرف سے شر کا کو بیسیہ ہوئے اس ڈاکو منٹ کو پڑھنے میں اسے کم سے کم چند رہ منٹ لگے۔ اس کے چند روزوں کا

شینڈل واقعی بہت hectic تھا۔ یہ ای میل اسے اس کے کس جیلے کی وجہ سے کی گئی تھی وہ اندازہ کر سکتی تھی

لیکن اس کے باوجود اس نے جوابی ای میل میں اس شینڈل کے بارے میں ایک لفظ کمانہ ہی اپنی شرمندگی کا

اظہار کیا۔

”تم نے فرقان کے گھر ڈنر پر جانا کیوں چھوڑ دیا؟“ سالار نے اس دن اس سے پوچھا۔

”میری مرضی۔“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ڈنر ٹیبل پر فرقان کو یا اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے اسے وہ یاد آتا تھا اور وہ ہر روز ڈنر کے بعد

کچھ زیادہ اپ سیٹ ہو رہی تھی اس لیے اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی۔

”میں جانتا ہوں تم بہت ہمارے ہو اکیلے رہ سکتی ہو تو ڈنر کرنا بھی تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر بھی ان کے

گھر جلی جاتیں تو کوئی ایکشن بنی ہوئی تمہارے پاس گن بے کار ناولز کو پڑھنے کے علاوہ۔“

”تمہیں کیا پروا ہے؟“ اس نے سالار کے جملے پر جریز ہو کر کہا تھا۔
 ”مجھے تمہاری پروا ہے۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھنا چھوڑ دو۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”تم نے مجھے نصیحتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے؟“ وہ صبر کرائی۔
 ”ہاں۔“

”تو کرتے رہو۔“
 ”تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ میں کہنا چاہتی ہو تم؟“
 ”تم باہر جا کر مجھ سے مس لی ہو کر گئے لگے ہو۔“
 ”کیا؟“ سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔
 ”میں باہر نہیں دہرا سکتی اپنی بات۔“ اس نے سرو مہری سے کہا۔
 ”میں مس لی ہو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟“ اس نے بے یقینی سے اس سے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ جواب بالکل دو ٹوک تھا۔ سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔
 ”میں اگر تمہیں کوئی عقل کی بات سمجھاتا ہوں تو میں مس لی ہو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟“

”اب تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں بے وقوف ہوں؟“ سالار کا دماغ محکوم کر رہا گیا۔
 ”میں نے کب کہا تم بے وقوف ہو؟“
 ”اب تم مجھ کو جھوٹا کہہ رہے ہو؟“ وہ بے بسی سے ہنس پڑا۔
 ”کیا ہوا ہے تمہیں امام؟“
 ”اب تم کہہ دو میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“
 ”یالی نیو۔“
 ”یوں نہیں؟“

”اچھا مت نیو۔ موسم کیسا ہے باہر کا؟“
 وہ اب موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ امام کے رد عمل پر بری طرح حیران تھا۔
 ”امام! کوئی پریشانی ہے تمہیں؟“ وہ اگلے دن نو شین کے ساتھ اس کے کہنے پر فوراً نہیں آئی تھی، جب ساتھ چلتے چلتے نو شین نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ بری طرح چونکی، پھر اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔
 ”نہیں۔ نہیں تو۔ کیوں؟“

”پھر اس طرح کم کم کیوں ہو؟“ نو شین کے لہجے میں تشویش تھی۔
 ”نہیں میں۔ میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”سالار کے ساتھ تو بات ہوتی ہے تمہاری۔؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟“
 ”نہیں تو۔ روز بات ہوتی ہے۔“ اس نے بے اختیار مسکراتے کی کوشش کے ساتھ ہی ٹوسلے پر لگے ایک سوٹ کی طرف نو شین کو متوجہ کیا۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتی کہ یہاں اس کے ساتھ بھرتے ہوئے اسے سالار بری طرح یاد آ رہا ہے۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار اس کے ساتھ وہاں آ کر کافی یا چائے پیتے ہوئے اسی طرح دھنڈو شاپنگ کرتے تھے جس طرح اب وہاں سے گزرتے ہوئے کچھ دوسرے جوڑے کر رہے تھے۔ وہ اسے یہ یاد آتا؟



”میگزین میں آج تم نے کچھ نہیں پڑھا ان مردوں کے بارے میں بھو احساس کتری کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟“ سالار نے اگلے دن فون پر اس سے بات کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔
امامہ کاموڑی طرح آف ہوا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ ایسے مرد نہیں ہوتے اور میں نے فضول بات کہی ہے۔“
”میں مذاق کر رہا تھا امامہ۔“ وہ کچھ جھٹکا ہوا۔

”ایک سنجیدہ بات کو مذاق میں لے رہے ہو تم۔“

”کون سی سنجیدہ بات؟ امامہ! تم آج کل کون سے میگزین پڑھ رہی ہو؟“ وہ کے بغیر نہیں رہ سکا۔
”جس میں اس سے کیا؟“ وہ مزید جھڑکی۔

”اگر تم مجھے اس طرح کے اسٹوڈنٹس ٹائپ سٹاؤگی تو میں پوچھوں گا تو سہی نا؟“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بحث کرنے لگا تھا۔ اب تقریباً ہر روز یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے فون کال کے اختتام پر اسے معذرت کر کے فون بند کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بھی صرف اس لیے تھا کہ وہ وہاں اپنی عہم موجودگی میں اس سے کوئی جھگڑا کر کے فون بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خود اس کے لیے بہت مشکل کا باعث ہوتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امامہ کو کیا ہوا ہے۔ وہ ناراض پہلے بھی ہوتی تھی مگر اس طرح کی باتوں پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔



سالار اگر اس کے بنتے بگڑتے موڈ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ہوتی رہتی اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ بلاوجہ اس سے جھگڑتی۔
اسے اس پر شدید غصہ آتا تھا اور کیوں آتا تھا یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ کئی سالوں بعد اتنے لمبے ڈپریشن کا شکار ہوئی تھی اور زندگی میں پہلی بار تین ہفتوں میں وہ ایک ٹاول بھی مکمل نہیں کر پائی تھی۔ پینٹنگ تو خیر دور کی بات تھی۔

وہ سارا دن بیوی ان کے اس کی کال کے انتظار میں بیٹھی رہتی یا پھر کمپیوٹر آن کیے پرانی ای میلز پڑھتے ہوئے کسی نئی ای میل کے لیے بیٹھی رہتی۔ چند لائسنز کی وہ ای میلز جن میں وہ اس کا حال پوچھتا تھا اور اپنی ایکٹیوٹی بتاتے ہوئے اس سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ ان ای میلز کو دور درازوں پر پڑھتی۔ ایک لمبا چوڑا جواب لکھ کر اس کی ای میل کے انتظار میں ساری ساری رات اس کی چیز میں نکال کر صاف کر کے ری آرینج کرتی رہتی یا پھر اس کی کوئیکشن میں موجود چار لکڑیوں کی موڈ پر مبنی رہتی۔ یہ واقعی بے بسی کی حد تھی کہ اسے وہ ایکسپریس بھی اب بری لگنا بند ہو گئی تھی جس کو وہ پہلے سالار کے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ہر روز کھانے کی ٹیبل پر وہ اس کے برتن بھی لگا دیتی تھے جیسے کھانے کی ٹیبل پر اپنی نعمانی دور کرنے کی کوشش تھی۔

رات کو سونے کے لیے اپنے بستر میں لیٹے وہ لائٹ آف کرنے کے بعد بھی کروٹ لیے، کتنی کتنی دیر اس کے بستر اور سرہانے کو دیکھتی رہتی۔ وہ سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے بعد بھی اس سے کچھ دیر باتیں کیا کرتا تھا اور اب یہ خاموشی اس کے اعصاب کو بری طرح مضطرب کر رہی تھی۔

عید کے لیے اسلام آباد جانے تک مگر کی اس خاموشی اور نعمانی نے اسے مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد بھی اس نے خود کو بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔ سالار کی پوری فیملی میں سے صرف عمار اور سیری عید منانے کے لیے وہاں موجود تھے، باقی افراد بیرون ملک تھے۔ پچھلی عید جیسی رونق اس بار وہاں نہیں تھی۔

سالار نے طیبہ کو اس کی عید کی شاپنگ کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ بڑے بچے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چلی گئی تھی، لیکن پچھلی عید جیسا اشتیاق اس بار اسے کہنوں کے لیے نہیں تھا۔ اسلام آباد آکر یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے گیسٹ روم کی کھڑکی سے لگ کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے نظر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ عید کی صبح پہلے کی طرح اس بار بھی وہ سالار کی کال پر ہی اٹھی تھی۔ وہ مائیکروال میں اپنا سیشن ختم کر کے کچھ دیر پہلے ہوٹل آیا تھا۔

”کون سے کپڑے پہن رہی ہو تم آج؟“ اس نے مبارک باد دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

”تمہیں بتانے کا فائدہ؟“ اس نے ہنڈ کے کراؤن کے ساتھ پشت نکالتے ہوئے کہا۔

”میں تصور کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیسی لگ رہی ہو گی؟“

”میرے سامنے تم نے کبھی میرے کہنوں کو غور سے دیکھا تک نہیں اب وہاں بیٹھ کر کیا تصور کرو گے؟“

”امام! ہم کم از کم آج آکر یہ نہیں کریں گے۔“ سالار نے مداخلت کرتے ہوئے جیسے پیشگی جنگ بندی کا اعلان کیا۔ ”تمہیں کیا چاہیے آج؟ فلاور ڈاور لیک تو می سے میں نے کہا ہے تمہارے لیے کچھ اور چاہیے؟“

”نہیں۔“ وہ بے حد اداس تھی۔

”مجھے مس تو نہیں کر رہیں تم؟“ سالار نے مذاق کیا تھا لیکن اس نے جیسے اس کی دیکھتی رنگ رہا تھا رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ اس نے اپنی آستین کے ساتھ آنکھوں کو گڑ گڑ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کی خاموشی پر غور کیے بغیر بات کر رہا تھا۔ کینڈا میں عید پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ عید کے دن بھی کانفرنس اینڈ کرنا رہا۔ وہ زندگی میں کئی عیدیں اسی طرح گزار چکا تھا۔ پچھلی عید اسے کم از کم اس عید والے دن اپنی مصروفیات کی وجہ سے یاد نہیں آسکی تھی، لیکن پچھلی عید امام کو پچھلے دو دن سے تنگ کر رہی تھی۔

”گپ کی فلائٹ ہے تمہاری؟“ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کی توازیات کرتے ہوئے نہ بھرائے یہ احتمالہ چیز تھی باقی چیزوں پر روٹنا ٹھیک تھا۔ لیکن کم از کم وہ اس کے سامنے اس کے نہ ہونے کے لیے نہیں رو سکتی تھی۔ وہ بڑی شرمندگی محسوس کرتی اگر وہ یہ جان جاتا کہ۔

وہ اب اسے فلائٹ کا تیار رہا تھا۔

”تم نے مجھے کہنوں کا کھر نہیں بتایا؟“ سالار کو بات کرتے کرتے یاد آیا۔ ”تم نے می کے ساتھ جا کر کپڑے لیے تھے؟“

”ہاں لیے ہیں میں نے۔ جو تین پہنوں کی وہ ہینزل گرین ہے۔“

”ہینزل گرین؟“ وہ بے اختیار انکا۔ ”وہ تو آنکھیں ہوتی ہیں۔“

”آنکھوں کا کھر ہوتا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے تصحیح کی۔

”اوہ۔ آج میں جینفر کی آنکھوں کو غور سے دیکھوں گا۔“ اس نے ڈنپر اپنی کسی ساتھی کا نام لیا۔

”کیوں؟“

”اس کی آنکھوں میں مجھے اپنی وانک کے کہنوں کا کھر نظر آئے گا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ بے اختیار فیس بڑی۔

”امام! جب سے میں یہاں آیا ہوں آج پہلی بار تم نہیں ہو۔“ سالار نے اس کی ہنسی کو نونٹس کیا تھا۔

”اور شادی کے بعد اتنے مہینوں میں یہ پہلا کمر ہے جسے تم نے Identify کیا تھا اور وہ بھی کسی عورت کی آنکھوں کی وجہ سے۔“

”تم جیلس ہو رہی ہو؟“ وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

”ہاں آپ بس یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے کرنے کے لیے۔“

اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”یعنی نہیں ہو رہی ہیں یا نہیں ہو سکتی ہیں؟“

وہ پوچھ رہا تھا اور وہ جواب نہ دے سکی۔ اس کی خاموشی پر وہ ہنسا تھا۔

”اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟“ وہ کچھ جڑبڑھائی تھی۔

”اپنی خوش تنہی پر ہنسا ہوں تم کم از کم کسی عورت سے میرے لیے توجہ جیس نہیں ہو سکتی۔“

وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی اس کا اشارہ رشتہ کی طرف تھا۔

”تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کب آ رہے ہو؟“

اس نے بات بدلنا بہتر سمجھا تھا اور وہی گھسا پٹا سوال کیا جو وہ اس سے کرتی آ رہی تھی۔



وہ عید کے دوسرے دن رات کی فلائٹ سے واپس لاہور آگئی تھی۔ کیونکہ اگلی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ

واپس آ رہا تھا۔ وہ زور زبانی اور حساسیت جو کچھ چار ہفتوں سے اسے ناخوش رکھے ہوئے تھی وہ یک دم جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔

اور چار ہفتے کے بعد بالآخر اس نے ٹیک کا وہ ٹکڑا اور وہ کین ڈسپوز آف کر دیے۔

اگر فرقان کو سیدھا ہسپتال سے ایمرپورٹ نہ جانا ہوتا تو وہ خود اسے رہسیدو کرنے چلی جاتی، وہ کچھ اتنی ہی

ایکسانہ نہ ہو رہی تھی۔

نوں بج کر پینتالیس منٹ پر بالآخر ڈور بیل بجی اسے دروازے تک پہنچنے میں سیکنڈز لگے تھے۔

”خدا یا! کیا خوشی اس کو کہتے ہیں جو اس شخص کے چہرے پر پہلی نظر آتے ہیں نے محسوس کی ہے؟“ اس نے

دروازہ کھول کر ڈور ہینڈل پر اپنا کپکپا ہوا ہاتھ رکھے سالار کو دیکھ کر اچھسے سے سوچا تھا۔

فرقان سے باتیں کرنا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہی گرم بخوش

مسکراہٹ جس کی وہ عادی تھی اور ہمیشہ کی طرح سلام میں بھی پہل اسی نے کی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چند لمحوں

کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔

”امام! مسلمان کی ڈیوڑھی دینے آیا ہوں، چپک کر لو، کوئی بریکج یا فلیپج تو نہیں ہے۔“ فرقان نے ایک سوٹ

کیس کھینچ کر اندر لے جاتے ہوئے اس کو چھینڑا۔ سالار مسکرایا تھا۔

امام نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے گلے میں کوئی گرہ لگنے لگی تھی۔ بات گلے کی گرہ

تک رہتی تو ٹھیک تھی، لیکن آنکھوں میں پانے کیسے اور کیوں آگیا تھا؟ وہ آگے بڑھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اسے

گلے لگایا، جیسے وہ آفس سے آنے کے بعد لگایا کرتا تھا۔ بے اختیار بے ساختہ آنسوؤں کا ایک اور ریزا آیا۔ یہی چیز

تو وہ دھونڈتی پھر رہی تھی، کچھلے چار ہفتوں سے یہی نرم لمس اپنے گرد بازوؤں کا یہی حصار۔ اس کے ساتھ گلے

اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے جسم سے اچھی ٹکون کی منگ ڈور تک نیل پر ٹکون کی حیشی سے اچھی

منک سے بالکل الگ تھی۔ وہ اس کے جسم پر گھسنے کے بعد زیادہ مسحور کن تھی زیادہ جان لیوا تھی۔
 ”کیسی ہو تم؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ گلے کی گرہیں اور بندھن تھکی تھیں۔ اس نے اب اسے خود سے الگ کیا اور اس کا چہرہ اور آنسو دیکھے۔

”کیا ہوا؟“ وہ غصہ کا اور سوٹ کیس اندر لے جاتے ہوئے فرقان نے پلٹ کر دیکھا۔
 ”میں ابھی۔۔۔ ابھی سلاہ کے لیے پاز کاٹ رہی تھی۔“ اس نے کچھ جھباہٹ میں مسکرائے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ پھر شاید اسے خود ہی یہ بہانہ کمزور لگا۔ ”وہ سر میں بھی کچھ درد تھا۔۔۔ اور غلو تھا۔“ وہ فرقان کی مسکراتی ہوئی نظروں سے کچھ گزری ہوئی تھی۔
 سالار نے فرقان کو نظر انداز کیا اور اسے ایک بار پھر ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
 ”تو بار! کوئی مینڈیشن لینی چاہیے تھی۔“

”کو کنگ ریٹج پر کچھ رکھ کر آئی ہوں۔“ وہ در کے بغیر کچن میں چلی آئی۔
 اس کے سامنے کھڑے رہ کر اس سے نظریں ملا کر بھڑکتے ہوئے پڑا مشکل ہو گیا تھا۔ منک میں جہرے پر پانی کے چپاکے مارنے کے بعد اس نے کچھ پانی پیا۔ آواز کی تھر تھراہٹ صرف اسی طرح ختم ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں اب اس کے عقب ’لاؤنچ‘ میں، کچن کاؤنٹر کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اپنا چہرہ کچن رول سے تھپتھپا کر اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔
 ”بیمبو! اما نا کھا کر جاؤ نا۔“ وہ جب لاؤنچ میں آئی تو سالار ’فرقان‘ سے کہہ رہا تھا۔
 ”نہیں“ اس وقت نہیں کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے بچے۔ کچھ دنوں کے بعد چلیں گے کہیں ڈنر کے لیے۔“ وہ بیوی درد اندہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ سالار دروازے تنک سے چھوٹے گیا۔ وہ کچن میں آکر کھانے کے برتن لگانے لگی۔

درد دروازے سے واپسی پر کچن میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے آیا تھا ’فون‘ پر سکندر تھے۔ امامہ نے اسے کچن کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل کو کھولتے دیکھا۔ فون ’اندھے اور کان کے بیچ دبائے‘ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ امامہ نے اس کے گلاس کی طرف جانے سے پہلے ’ایک گلاس‘ اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ سالار کے ہاتھ سے بوتل لے کر اس نے گلاس میں اس کے لیے پانی ڈالا۔ سالار نے سکندر سے بات کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پچھانی کا کھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”ایسا بغیر پت پوچھ رہے ہیں تمہاری۔“

فریق کا درد اندہ کھولتے ہوئے وہ مسکراتی۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔“ سالار نے اس کے نیلے پر غور کیے بغیر سکندر تک اس کا جملہ پہنچا دیا۔

کاؤنٹر پر بڑے سلاہ میں سے سیب کا ایک کھڑا کاٹنے سے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے ’وہ اسی طرح فون پر سکندر سے بات کرتے ہوئے کچن سے نکلا۔ امامہ نے اسے ٹیبل سے کا درد اندہ کھول کر ٹیبل کے یوہوں پر نظر دوڑاتے

دیکھا۔ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آنے لگی۔ ایک صینہ کے بعد یہ جگہ اسے ”گھر“ لگتی تھی اور اس کی وجہ گھر میں گو بجتی وہ ”آواز“ اور اوھر سے اوھر جاتا اس کا وجود تھا۔ برتن رکھنے کے باوجود وہ جیسے بے اختیاری کے عالم میں ٹیبل کے پاس کھڑی ’فون‘ کلن سے لگائے ’سالار کو ٹیبل پر اوھر سے اوھر کھلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بات محبت کی نہیں عادت کی تھی۔ اسے اس کی عادت ہو گئی تھی اور عادت بعض دفعہ محبت سے بھی زیادہ جان لیوا عادت ہوتی ہے۔

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ کھانا کھانے سے پہلے کپڑے تبدیل کرے گا۔ بیڈ روم میں جا کر وہ اس کے لیے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکا کر آئی۔

وہ واش روم سے نکل رہی تھی جب بیڈ روم میں داخل ہوا۔

”میں شاور لے کر کھانا کھاؤں گا۔“ اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔

وہ نہ بھی کہتا پھر بھی وہ جانتی تھی وہ سفر سے واپسی پر پیشہ نماگر ہی کھانا کھاتا تھا۔

”میں نے تمہارے کپڑے اور ٹائوٹر رکھ دیے ہیں اور یہ میں تمہارے لیے نئے سلپرز لے کر آئی تھی۔“ وہ

سلپرز کا ڈبا شوریک سے نکالتے ہوئے بولی۔

”رہنے دو امامہ! میں خود ہی نکال لوں گا۔“

رہسٹ وائچ اتارتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا۔ اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اپنا جوتے اٹھانا پسند نہیں تھا۔

وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود وہ سلپرز نکال لاتی تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے سلپرز اس کے پاس رکھ دیے۔

وہ اب بیڈ پر بیٹھا اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا اور وہ بے مقصد اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

شادی کے اتنے مہینوں میں آج پہلی بار وہ اس طرح بے مقصد اس کے پاس کھڑی تھی۔ سالار نے کچھ حیرانی سے

نوش کیا تھا۔

”یہ یو کپڑے تم نے میرے انتظار میں پہنے ہیں؟“ اس نے جرابیں اتارتے ہوئے امامہ کو چھیڑا۔ وہ بے وجہ

ہنسی۔ وہ مسنؤ کو یو کہہ رہا تھا، لیکن آج اس نے اس کی صحیح نہیں کی اور اس نے آج بھی اس کی تعریف نہیں کی

تھی مگر اسے یہ بھی برا نہیں لگا تھا۔

”ہائس سلپرز!“ اپنی جرابیں اور جوتے اٹھاتے ہوئے اس نے سلپرز پہنے اور امامہ سے کہا۔

”میں رکھتی ہوں۔“ امامہ نے جوتے اور جرابیں اس سے لینے کی کوشش کی۔

”کیوں یار! ملے کون رکھتا ہے؟“ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے روکا ”امامہ رک گئی۔ واقعی وہ اپنے جوتے خود

اٹھانے کا عادی تھا۔ جوتے شوریک میں رکھتے ہوئے اس نے لائنڈری باسکٹ میں جرابیں ڈالیں اور واش روم میں

گھس گیا۔

امامہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی اس کی رہسٹ وائچ اور سیل فون کو دیکھا۔ ہر خالی جگہ بھرنے لگی تھی۔

وہ جب تک نما کر تیا امامہ کھانا لگا چکی تھی۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار کہا۔

”امامہ! کیا کیا پکا رکھا ہے یار!“

”جو جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔“ اس نے سراوگی سے کہا۔

”مجھے؟“ توہ کر سیکھ کر بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر پھیلی ہوئی ڈشز دیکھ کر جیسے کسی سوچ میں پڑا۔

”تم نے اپنا وقت ضائع کیا۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ پورے دن کی محنت پر مولے جانے والے اس جملے پر بری طرح ناراض ہوتی بلکہ آج

اسے کچھ برا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا، وہ اتنی ہی سرشار تھی۔

”میں نے اپنا وقت تمہارے لیے استعمال کیا۔“ اس نے مدھم تواز میں سالار کی صحیحی۔

”لیکن تم تنگ گئی ہو گی۔؟“

”نہیں۔ کیوں تنگوں گی میں؟“ اس نے چاؤلوں کی ڈش سالار کی طرف بوجھائی۔

سالار نے اس کی پلیٹ میں ہمیشہ کی طرح، پہلے چاول ڈالے اپنی پلیٹ کے ایک کونے میں پڑے ان چاولوں کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ تو اتنے دنوں سے یہ ایک چیز تھی جو وہ مس کر رہی تھی کھانے پر اور یہ "ایک" چیز نہیں تھی۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔ ایک مینے کے بعد وہ اس کے اتنے قریب چھٹی تھی۔ کھانا سو کرتے اس کے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ کی آستینیں موڑے اس کے ہاتھوں نے ہمیشہ کی طرح اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار اس کے ہاتھ چھونے کو چاہا اس نے بالکل نظر ثنائی خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے یہ ایک دم بہت مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو اور وہ صرف کھانے کی طرف متوجہ رہے۔

"ہشنگز مکمل ہو گئی ہیں تمہاری؟"

وہ کھانا شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ نے چونک کر نیل پر بڑا کانٹا اور پیچ اٹھایا۔

"کون سی ہشنگز؟" اس نے بے خیالی میں کہا، وہ غٹکا۔

"تمہاری تمہیں نا کچھ؟" اس نے نیا دولا یا۔

"یہ بھی اوب۔" جواب دینے کے بجائے اس نے ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"ڈر تو نہیں لگا تمہیں میاں کیلے رہتے ہوئے؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"کھانا اچھا ہے؟" امامہ نے ایک بار پھر جواب گول کیا۔ وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی بالکل ویسے ہی جیسے وہ سچ نہیں بول سکتی تھی۔

"ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"کتنے تلوڑے تم نے؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔

"یہ چوبیس بھی ہیں۔" اس نے ایک اور ڈش سرو کی۔

"تمہاری فلائٹ ٹھیک رہی؟"

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی مشکل سوال کرتا اس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

"ہاں اور آل بکھ bumpy رہی۔ لیکن ٹھیک ہی تھی۔" اس نے بتایا۔

"اور کانفرنس بھی اچھی رہی؟"

"ایکسی لینٹ؟" اس نے بے اختیار کہا۔

"کیا روٹین تمہیں تمہاری؟" وہ اسے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

"میری روٹین۔" وہ سوچ میں پڑی۔

"ہاں! کیا کرتی تھیں سارا دن؟" وہ اب چپاتی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جو پہلے کیا کرتی تھی۔" اس نے نظریں چر کر ایک اور ڈش اس کی طرف بڑھائی۔

"لیکن تب تو بہت نیا وقت ہوتا ہو گا تمہارے پاس۔" اس نے کبیرا تھا۔

"بالکل ساری شام تمہاری رات۔"

"پھر تو ہمیشہ ہو گئے ہوں گے تمہارے؟" اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی پلیٹ کو دیکھا جس میں چیزوں کا ڈھیر بالکل اسی طرح بڑا تھا۔ اس سے کچھ کھانا نہیں جا رہا تھا۔ سالار کو اتنی رغبت کے ساتھ کھاتے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا بچہ بھر رہا ہو۔

"تم سعیدہ اماں کو یہاں لے آئیں۔" سالار نے یک دم اس سے کہا۔ اسے بتائیں کیا خیال آیا تھا۔

"میں نے کہا تھا ان سے، لیکن تمہیں تو پتا ہے، وہ اتنے دنوں کے لیے اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔"
اس نے جواب دیا۔

"That's understandable۔" سالار نے کہا، "کھانا کھاتے ہوئے بے اختیار ایک نوالہ اس کی طرف پڑھایا۔ وہ آخری لقمہ بیٹھ اسے ہی کھاتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ فحشی پھر اس نے لقمہ منہ میں لے لیا، لیکن وہ اسے چبا نہیں سکی۔ وہ لقمہ جیسے آخری حد ثابت ہوا، وہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ بالی پتے پتے ایک دم رک گیا۔
"کیا ہوا؟" وہ کہا کا تھا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔
"کیا ہوا ہے امامہ؟" وہ بری طرح بدحواس ہوا۔ کم از کم اس وقت اس طرح کی فحشوں کے دوران آنسو۔؟ وہ ان کی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔

ایک دفعہ آنسو بہ جانے کے بعد سب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ مزید رونا، بے بسی کا اظہار اور کمزوری کا اعتراف۔ اب مزید دیواریں کھڑی رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔
"قادر کا ڈیسک۔" مہیا گل کر دوگی مجھے، "کیا ہوا ہے۔؟ سب کچھ ٹھیک رہا میرے بعد؟ کسی نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟" وہ اب مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔ نشوونما سے آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"تو پھر کیوں رو رہی ہو؟" سالار مطمئن نہیں ہوا تھا۔
"ایسے ہی بس میں تمہیں بہت مس کرتی رہی اس لیے۔" وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔
کیا شرمندگی سی شرمندگی تھی جو اس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ سالار کو لگا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی تھی۔
"کس کو مس کیا؟"
"تمہیں۔" اس نے سر جھکا کر روتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔

"مجھے کس لیے؟" یہ بے یقینی کی انتہا تھی۔
وہ روتے روتے فحشی۔ اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا، پھر بے حد فحشی کے عالم میں نمبل سے اپنی ڈنڈلیٹ اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
"میرا داغ خراب ہو گیا تھا اس لیے۔" وہ کچھ بول نہیں سکا۔
شادی کے تقریباً چار ماہ میں اس نے پہلی بار یہ جملہ اس سے کہا تھا، ورنہ وہ آئی لوہو کے جواب میں بھی تنہیک بولنے کی عادی تھی۔
وہ اب برتن اٹھا اٹھا کر اندر لے جا رہی تھی اور سالار بالکل ہونٹ سا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے اسے اپنے سامنے سے برتن ہٹاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے سے کبھی اتنا حواس باختہ نہیں ہوا تھا، جتنا اس کے اس معمولی سے اعتراف سے ہو گیا تھا۔

وہ شاکزدہ ہوا تو کیا کرتا۔ وہ چار ہفتے پہلے بڑے دھڑلے سے اسے کہہ رہی تھی کہ۔ اور پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے بہت کی طرح گری پر بیٹھے، گوئی اس کے سامنے جیسے کسی معرکہ کے گلوے ترتیب دینے لگا تھا۔ وہ چار ہفتے باہر رہ کر اس کے جس رویے کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا، وہ اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ ناقابل یقین تھا کم از کم اس کے لیے کہ امامہ اس سے۔

اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ کچن میں اوھر سے اوھر جاتے ہوئے اسی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

وہ گلاس ٹھیل پر رکھ کر بچن میں آیا وہ فریج سے سوٹ ووش نکال رہی تھی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ڈونگا پکڑ کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کچھ کے بغیر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ چوٹی غری سے یوں جیسے تلانی کر رہا ہو معذرت کر رہا ہو۔ وہ غلطی سے الگ ہونا چاہتی تھی اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی۔ فی الحال دنیا میں وہ واحد شخص تھا جو اسے اس طرح گلے لگاتا تھا۔ برسات پھر ہونے لگی تھی۔ وہ اس کی عادتیں خراب کر رہا تھا کسی پیراسائنٹ کی طرح اسے اپنا محتاج کر رہا تھا۔

وہاں کھڑے دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا، کوئی معذرت، کوئی اظہار محبت، کچھ نہیں۔ زندگی کے اس کھیل میں لفظ فالتو تھے جس میں وہ لپڈ کر رہے تھے۔

برسات ٹھمنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ سے گال اور آنکھیں خشک کرتی اس سے الگ ہو گئی۔
”در اصل میں گھر میں آگئی تھی اس لیے مس کرتی رہی۔“

انکار، اقرار، اعتراف، پھر انکار۔ یہ مشرقی عورت کی زندگی کا دائرہ تھا وہ بھی اسی دائرے میں گھومنے لگی تھی۔ جھوٹ کی ضرورت پھر آتی پڑی تھی۔ اپنے گرد کھڑی دیوار کے شکاف کو اس نے پھر سے بھرنا شروع کر دیا۔
”ہاں“ اکیلے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ سالار نے اس جھوٹ کو بچ جانے میں اس کی مدد کی۔ امامہ کا حوصلہ بڑھا۔

”دانت میں درد تھا تو۔ تو۔ اس لیے مجھے رونا آگیا۔“ وہ انکی پھر اس نے کہا۔
”ہاں“ مجھے اندازہ ہے دانت کا درد بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہوا تھا مجھے۔ میں جانتا ہوں کیا حالت ہوتی ہے۔“ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے وہ نظریں ملائے بغیر جھوٹ بول رہے تھے۔
”آہ۔ آہ۔“ وہ انکی اب تیسرا جھوٹ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ جو سوال آ رہا تھا اس نے وہی پوچھا ”تم نے مجھے مس نہیں کیا؟“ وہ پھر غلطی کے اسی موڑ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔
”ہر دن ہر گھنٹہ ہر منٹ ہر سیکنڈ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور امامہ کی آنکھوں میں

جیسے ستارے جھلکانے لگے تھے۔ بعض دفعہ ہم کوئی فلاسفی، کوئی حقیقت نہیں سننا چاہتے، بس وہی روایتی باتیں سننا چاہتے ہیں جنہیں فلم کے پردے اور کتاب کے صفحے پر ہم ہزاروں بار پڑھتے ہوئے جنتے ہیں، وہ بھی روایتی باتیں کر رہا تھا وہی جملے جو اس وقت اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔
”چار بھتے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اگر تمہارا خیال ساتھ نہ ہوتا تو میں مرجاتا۔“
”تم جھوٹے ہو۔“ وہ بھرائی گوازیں دوتے ہوئے ہنسی تھی۔
”تم بھی۔“ سالار نے بے ساختہ جتایا۔

وہ دوتے ہوئے ہنس رہی تھی یا بھتے ہوئے رو رہی تھی، لیکن چار ماہ میں پہلی بار سالار کے لیے وہ برسات قابل اعتراض نہیں تھی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ ”برسات“ سے کبھی بھی ڈبو سکتی ہے۔



وہ اس رات بند پر اس سے چند انچ دور گھومت کے بل لیٹے، کبھی تکیے پر ٹکائے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک مہینے کے دوران انکبھی ہو جانے والی ساری باتیں۔ بے مقصد، بے معنی چیزوں اور واقعات کی تفصیلات، ہنس کی کھل آنکی، ہنس سے اس کی کیا بات ہوئی، ملازمہ نے اس سے کیا کہا، فی وی پر چلنے والے کسی پروگرام میں اس نے کیا دیکھا، گون سے میگزین میں اس نے کیا پڑھا۔ میرس پر رکھے کتنے نوووں پر نئے پھول لگے ہیں، فرقان اور

نوسین کے بچے نقتی بار اس کے گھر آئے وہ نوسین کے ساتھ نقتی بار بازار گئی کیا خرید کیا پسند نہیں آیا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ صرف وہ بول رہی تھی۔ سالار بالکل خاموش چپ لیٹا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ پر سر رکھتے ہوئے وہ سرے ہاتھ سے غیر محسوس انداز میں اس کے بازو پر انگلی سے چھوئے بڑے دائرے بناتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ ”خاموش سامع“ پبلیس جھپکائے بغیر صرف اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات اس کے چہرے پر جھلکنے والے رنگ اس کے ہونٹوں کی حرکت بات کرتے ہوئے اس کی ہنسی کی کھلکھلاہٹ اس کے چہرے پر کھلنے والے رنگ وہ جیسے سینما کی فرٹن رو میں بیٹھا ہوا ایک سرزدہ ناظر تھا۔ کبھی کے مل سیم دروازے جب وہ تھک جاتی تو پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کبھی ”اچھا چلو“ اب سو جاتے ہیں۔“

یہ جملہ وہ شاید پچیس دفعہ کہہ چکی تھی۔ اس کے کندھے پر سر رکھنے اسے پھر کچھ یاد آتا تو وہ یک دم سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھتی ”میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ۔۔۔؟“

سالار نقتی میں سر ہا دوتا گفتگو پھر دوا رہا وہیں سے شروع ہو جاتی۔ خاموش سامع پھر ”وہی“ قلم دیکھنے لگتا۔ ”یہ کون سی اذان ہو رہی ہے؟“ وہ بات کرتے کرتے چو لگی۔

دور نہیں سے اس نے اذانوں کی آواز سن سنی تھیں۔ ”نچرکی۔“ سالار نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ بری طرح گڑ بڑاتی۔ ”اوہ والی گاؤ! خبر ہو گئی۔ اور میں۔۔۔ تمہیں تو سونا چاہیے تھا تم تو تھے ہوئے تھے۔ مجھے بتائی نہیں چلا۔ تم مجھ سے کہہ دیتے۔“ وہ اب بری طرح تادم ہو رہی تھی۔ ”مجھ سے کہنا چاہیے تھا تمہیں۔ کیوں نہیں کہتا تم نے؟“ ”کیا کہتا؟“ وہ اب پرسکون تھا۔ ”میں کہ تم سونا چاہتے ہو۔“

”لیکن میں تو سونا نہیں چاہتا تھا۔“ ”لیکن مجھے تو وقت کا پتا نہیں چلا تم ازم تمہیں بتانا چاہیے تھا مجھے۔“ ”دو واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔“ ”تمہارا خیال ہے مجھے وقت کا احساس تھا؟“

”تم سو جاؤ اب اور اتنی ایم سو رہی۔“ نقتی فضول باتیں کیں میں نے ”تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے؟“ اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی دیر سے اکیلی بیٹھ رہی تھی۔ وہ ہوں ہاں تک نہیں کر رہا تھا۔

”میں تو نماز پڑھ کر سو رہی تھی اب اور میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آج تم نے مجھ سے اتنی باتیں کیسے کر لیں۔“ ”تم نے تو غور سے سنی بھی نہیں ہوں گی میری باتیں۔“ ”وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی۔“

”ایک ایک بات سنی ہے۔ چاہو تو شروع سے دہرا دیتا ہوں۔ آج تک تم نے جب جب ہو جو کہا ہے مجھے یاد ہے۔“

”اب ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“ اس کا لہجہ ہموار تھا، لیکن آنکھوں میں کوئی تاثر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو پائیدار تھا۔

”اسی طرح باتیں کرو گی تو ہر رات جاگ سکتا ہوں تمہارے لیے۔“ امامہ نے نظریں چرائیں۔ بعض دفعہ اس سے نظریں ملانا اس کی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس زندگی کے بارے میں بھی کچھ کہنا مشکل ہو جاتا تھا، وہ اس کے ساتھ گزار رہی تھی۔

اس سے کچھ دور ہتھ ہوئے اس نے عجیبے سر رکھ دیا۔ وہ اب سیدھی لپٹی ہمت کو دیکھ رہی تھی۔
سائڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے بیک مینجے الارم کو بند کرتے ہوئے سالار نے اس کی طرف گھوٹ لی۔ کبھی
کے بل سے مہر آواز اس نے امامہ سے کہا۔

”کچھ اور بتانا ہے تم نے؟“ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔
”نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”تلی لو پیو۔“ جواباً سالار کے جھپٹے نے چند لمحوں کے لیے اسے ساکت کیا۔ وہ اس کے پاس تھا اس کی
آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے جواباً اس سے کچھ سننے کی خواہش رکھتا ہو۔ امامہ نے کبھی اس کی آنکھوں کو اتنی
آسانی سے نہیں پڑھا تھا۔ شاید وہ اتنے قریب تھا اس لیے۔ وہ جیسے اپنی آنکھوں سے اسے پھاننا کر کے ہوئے
تھے۔

”تھینک یو۔“

وہ بے اختیار ہنسا۔ ایک گہرا سانس لے کر ایک لمبے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے جیسے محنت
ٹیک دی تھی۔ بعض خواہشیں کوشش سے پوری نہیں ہوتیں اور بعض سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل پاتا۔
وہاں اس کے اتنے قریب کوئی اور عورت ہوتی تو اسے ”اظہار محبت“ ہی ملتا۔ یہ امامہ ہاشم تھی اس کا ”اظہار
تفکر“ ہی کافی تھا۔ اس پر جھکتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اس کے ہونٹ چھوئے پھر اس کا ہاتھ پھر وہ بند سے
اٹھ گیا۔



”یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔“ وہ دس بجے کے قریب اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ٹیبل صاف کر رہی
تھی جب وہ بند روم سے ایک خوب صورت پینٹنگ میں ایک باکس لے کر اس کے پاس آیا تھا۔
”یہ کیا ہے؟“ وہ ٹیبل صاف کرتے کرتے رک گئی۔
”دیکھ لو۔“ سالار نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔

”جیو لری ہے؟“ اس کو ————— لیبل اور باکس کے ذرائع سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار جواب
دینے کے بجائے کندھے اچکا کر خاموش رہا۔ امامہ نے بڑے جتن اور احتیاط سے اس باکس کی بے حد نفیس اور
خوب صورت پینٹنگ کو ہٹا کر باکس کھول لیا۔ سرخ مٹل جیسے ایک بے حد تعین اور جنگ دار کپڑے کی تھوں کے
درمیان ایک کرمل رنگ کیس تھا اور اس کیس سے نظر آنے والی رنگ نے کچھ دیر کے لیے اسے ساکت کر دیا
تھا۔ اسکو ڈائمنڈ کے جینڈ کے ساتھ وہ ایک پائلمنٹ ٹیپ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ جو ڈیڑھ کے اس ڈائمنڈ کے گرد
نچھے نچھے جلیک کے گول گول گیمینوں کا ایک دائرہ تھا۔ بہت دیر۔ سمراتہ اس رنگ پر نظر میں جمائے اس نے بے
اختیار گہرا سانس لے کر اپنا پسلا رو عمل دیا۔ یہ صرف ڈائمنڈ ہی نہیں تھے جو اس کی نظروں کو خیر کر رہے تھے بلکہ
وہ پیچیدہ ڈیزائن بھی جس میں وہ سارے جیولرز تھے۔

”یہ بہت خوب صورت ہے۔“ اس نے ہنسنے لگا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر کرمل کا کیس کھول کر رنگ کو نکال
لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے وہ رنگ اس کی انگلی میں پھنسا دی۔
”ہاں یہ اب خوب صورت لگ رہی ہے۔“

رنگ ہنسانے کے بعد اس نے اس کے ہاتھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔
”اور دیکھو! یہ بالکل میری انگلی کے سائز کے مطابق ہے۔“ وہ جیسے کچھ اور ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔
”تمہاری انگلی کا سائز لے کر بنائی گئی ہے کیونکہ تمہاری ایک رنگ لے کر گیا تھا میں۔“

اس نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا جس میں وہ رنگ بھی۔ اس رنگ نے اس کے ہاتھ کو چاہا تھا۔ وہ جس ہاتھ میں بھی ہوئی دیکھنے والے پر ایسا ہی تاثر چھوڑتی۔
 ”یہ ویڈیو تک گفت ہے تمہارے لیے۔“ سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا۔

”ویڈیو تک گفت۔؟ چار ماہ ہو گئے ہیں شادی کو۔“
 ”ہاں! میں نے تمہیں ویڈیو تک گفت نہیں دیا تھا۔ پہلے یاد نہیں تھا بعد میں پیسے نہیں تھے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”اور اب کہاں سے آئے پیسے؟“
 ”آگئے نہیں۔“ اس نے ٹالا۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے۔“ وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔
 ”میں نے کب کہا کہ۔“

”چلو! ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور سعیدہ اماں سے بھی مل کر آتے ہیں۔ میرے بیگ میں کچھ گفتیں ہیں ان کے لیے وہ نکل لو۔“ سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔
 ”تھیک بک ہو سالار! وہ جاتے جاتے تھنک۔“
 ”کس لیے؟“
 ”ہر چیز کے لیے۔“

”یہ سب تمہارا ہی ہے۔“ امامہ نے نظریں چرائیں۔
 ”میں نے سوچا تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ تم نے مجھے شادی پر کوئی گفت نہیں دیا۔“ اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ واحد گلہ تھا جو وہ اپنے دل میں سالار کے لیے رکھے ہوئے تھی۔
 ”نہیں بھولا نہیں تھا۔“

امامہ کو لگا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ سالار نے بات اوھوری چھوڑی تھی یا بدلی تھی یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔



”مائی گاؤں! دیکھو۔“ وہ آگے بڑھے پر چلتے چلتے بے اختیار جھکی تھی۔

سالار نے اس کی نظریں کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں دیس گورس میں گئے والے ایک میلے کو دیکھنے آئے تھے۔ اب بے مقصد میلے کی جگہ سے کچھ دور چل قدمی میں مصروف تھے جب امامہ اس آگے بڑھنے کی طرف درختوں کے اطراف پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس میں نظر آنے والے عکس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ پچھلی رات کی پارش کا پانی تھا جو ابھی پوری طرح ڈیرن آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ دیو قامت درختوں کے تنوں اور شاخوں پر لگے درختیں ہلتی لھکتی اور نیو نیو لائٹس کا عکس نیچے جمع شدہ پانی میں بڑبڑاتا تھا۔

اس عکس کو دیکھتے ہوئے وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح حیران رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی رنگ و نور سے بھری کسی داوی کے کنارے کھڑے اس میں چمکتے ہوئے درختیں ہیرے جواہرات کے درخت دیکھ رہے ہوں یا الف لیلٰی کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہوا کے جھونکوں سے پانی میں بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور ان روشنیوں اور درختوں کا عکس متعکس ہو کر جیسے محو رقص تھا۔ عکس ہو شرا جیسے پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔

”میں لگ رہا ہے جیسے جنت میں رات ہو گئی ہے۔“
طویل خاموشی کے بعد اس نے لامہ کی تواضع کی۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر ابھی تک اس پانی کو دیکھ رہی تھی جس کی روشنیوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔
”ایسی ہوتی ہوئی جنت؟“ سالار نے اسے کہتے سنا۔

وہ کچھ کہنے کے بجائے دوبارہ اس پانی کو دیکھنے لگا۔ اس وسیع و عریض پارک کی روشنیوں سے جہہ نور بنے ہوئے جیسے میں گھومتے لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو پارہا ہو گا کہ وہاں سے بہت دور ایک نیم تاریک روش پر کھڑے دو لوگ پانی میں نظر آنے والے ایک عکس میں جنت ڈھونڈ رہے تھے۔
”جنت میں ستارے ہوں گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں! بہت سارے ہوں گے۔“ اس نے اندازہ لگایا۔
”اتنے رنگوں کے؟“ اس نے ان روشنیوں کے رنگ گنے۔
”کائنات میں موجود ہر رنگ۔“ وہ بے اختیار ملاحظہ ہو کر ہنسی اسے جواب پسند کیا تھا۔
”رات ایسے ہی منور ہوتی ہوگی؟“ عکس پر نظریں جمائے وہ جیسے بے خود ہو رہے تھے۔
”اس سے زیادہ روشن اس سے زیادہ منور۔“ سالار نے بے اختیار کہا۔ وہ جھلی اور اس نے اپنی انگلیوں سے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ سالار نے بروقت اسے کھینچا۔
”درختوں پر لائٹس آن ہیں پانی میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ ناراض ہوا تھا۔
”میں اسے چھونا چاہتی تھی۔“
”یہ عکس جنت نہیں ہے۔“
”جنت میں اور کیا ہو گا؟“

”تم؟“ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ عکس کو دیکھ رہا تھا۔
”صرف میں اور تم نہیں ہو گے؟“ پتا نہیں اس نے گردن موڑ کر بے حد عجیب مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”تو پھر تم کیسے جانتے ہو کہ میں وہاں ہوں گی؟“ اس نے اسے ٹھک کیا۔
”جنت کے علاوہ کہیں اور رکھا جاسکتا ہے تمہیں؟“ اس نے جواباً سوال کیا۔ اس کے لیے میں رشک تھا وہ جس بڑی۔

”آپنی آسانی سے مل جاتی ہے جنت؟“ اس نے جیسے سالار کو بتایا۔
”مجھے آسانی سے نہیں ملے گی، تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔“ اس کا لہجہ پھر عجیب سا تھا۔
”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔
”تم بگنی آسانی سے ہر چیز میں جنت ڈھونڈ لیتی ہو میں آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔
دو دن پہلے وہ گھر کے لیے لیمپ خریدنے گئے تھے۔ انہوں نے بیڈ روم کے لیے لیمپس کا ایک سیٹ خرید لیا اور وہ رات کو ٹاول بڑھتے بڑھتے لیمپ شیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ اسی میل چیک کرنے کے بعد اپنا لیمپ ٹاپ بند کرنے لگا تو اس نے لامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی طرح لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔
”کیا دیکھ رہی ہو تم؟“ وہ حیران ہوا۔

”بیوی مل۔“ اس نے جواباً بے ساختہ اسی طرح لیمپ شیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سالار نے قدرے حیرانی سے اپنے سائیڈ نیبل پر بڑے لمبے شید کو دیکھا۔
 ”ہاں! اچھا ہے؟“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ خوب صورت لمبے ہنس تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ وہ
 ان پر پول نظر سے گاڑ کر بیٹھ جاتا۔

”یہ کون سے پھول ہیں؟“ وہ ابھی بھی لمبے شید پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔
 ”پھول؟“ سالار نے حیرانی سے لمبے شید کو دوبارہ دیکھا۔ اس نے پہلی بار اس پہل کر کے شید پر بنے پھیلن کو
 دیکھا۔ اس شید کا ٹھیک جو کچھ عجیب تھا۔ کاغذ نما اس کپڑے پر سنہری مائل پیلے پھولوں کا ایک بے حد مہین اور
 نفیس پھیلن تھا جو صرف لمبے کے تن ہونے پر نظر آ رہا تھا۔ ان پھولوں میں نہیں کہیں کر مزن لکری کوئی چیز چمکتی
 ہوئی نظر آتی، نہ جسم پر مٹی پھر چند لمحوں کے بعد وہی چیز چمکتی۔

”نہ یہ گلاب ہیں اور نہ ہی نیلے ہیں، تو وہ اس بلو نیل سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ بھی نہیں۔“ وہ جیسے پھولوں کو
 پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔
 ”ایسے پھول جنت میں ہوں گے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”اچھا۔“

”دیکھو یہ پھول رنگ بدل رہے ہیں۔ لیکن یہ رنگ نہیں بدل رہے بلکہ یہ کھل رہے ہیں۔“ وہ لمبے شید پر
 بنے پھولوں پر اب انگلی پھیر رہی تھی۔ سالار جیسے کسی سحر میں آیا تھا۔ وہ پھول واقعی بار بار اٹھتے ہوئے محسوس ہو
 رہے تھے۔

”I envy۔“ وہ سراپے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں اب سمجھ آیا تھا کہ وہ لمبے اتنے مہنگے کیوں تھے۔ دین کی روشنی
 میں سیلزمین بھی انہیں وہ پھیلن نہیں دکھا سکتا تھا۔ شاید اس لیے اس نے انہیں صرف ڈیزائن اور روشنی ہی کے
 حوالے سے بتایا تھا۔

اور ایک ہفت پہلے اس کی دراز صاف کرتے ہوئے سالار کی ویسٹ پیپر اسکٹ میں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ اس
 کے پاس لے کر آئی۔

”ہاں! اسے پھینک دیا ہے میں نے۔ بے کار ہے۔“ اس نے فی وی دیکھتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں وہ پوسٹ
 کارڈ دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کارڈ کو لیے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”سالار! یہ دیکھو کتنی خوب صورت جمیل ہے اور وہ کھو کتنا سکون ہے اس جگہ پر۔“ سالار نے اس کے ہاتھ
 سے پوسٹ کارڈ لے کر اس پر ایک نظر دوڑائی۔ وہ کسی بیننگ کا پوسٹ کارڈ تھا۔ کسی پینٹر کا بنایا ہوا الینڈا سکیپ
 ایک بہت چھوٹی سی کم کمرے کنارے والی جمیل جس کے کنارے جنگلی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان
 پھولوں کا عکس جمیل کے پانی میں نظر آ رہا تھا۔ کچھ پھول ٹوٹ کر پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ جمیل کے کنارے
 ایک چھوٹی سی لکڑی کی کشتی تھی جس میں صرف ایک چوڑا تھا اور وہ کشتی صرف دو افراد کے لیے تھی۔ جمیل کی
 سطح پر کچھ آبی پر نہرے تیرتے نظر آ رہے تھے۔

”یہ صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ اس کشتی کا رنگ دیکھو یہ صندل کا رنگ ہے۔“

وہ پوسٹ کارڈ پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔
 ”ایسا لگتا ہے جیسے صحرے کوئی اس کشتی میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہو۔ ایک مہنگی خوشبودار بیٹی ہوئی کشتی
 میں۔ اور ہوا چل رہی ہو۔ اور جمیل میں اس کشتی میں بیٹھے خوشبودار ہوا کے جھونکے ذرا تصور کرو۔“ اس
 نے بے اختیار گہرا سانس لیا تو جیسے اپنی قلمی تصویر سے خود محفوظ ہوئی ہو۔

”کشتی Serenity ہے اس سین میں۔ ایسے جیسے یہ جنت ہو۔ میں نہ بتاتی تو تم تو اسے پھینک رہے تھے۔“

وہ بے اختیار اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اس کی زندگی میں نہ آتی تو وہ جنت کو۔۔۔

”اس کی پچھلے سالوں کی سیل فون کے ساتھ۔“ امامہ کی آواز نے یک دم اسے چونکا دیا۔ وہ اب بھی اسی عکس کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ سالار نے سیل فون نکال کر چند تصویروں میں کچھ چھپیں اور سیل اسے دکھا دیا۔ اس نے باری باری ان تصویروں کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

”چلیں؟“ سالار نے کہا۔

”ہاں۔“ ان دونوں نے ایک آخری نظر اس عکس پر ڈالی اور پھر آگے چل پڑے۔

سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”خاموش کیوں ہو گئے۔؟ کوئی بات کرو۔“ امامہ نے چند قدم چلنے کے بعد اس سے کہا۔

”تم کرو میں سن رہا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں مجھ سے پہلے جنت مل جائے۔“ امامہ نے اپنے ہیلے کا مفہوم سمجھے بغیر اسے تسلی دی۔ وہ

بہس پڑا تھا۔

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔“ وہ دم دم آواز میں بڑبڑایا۔

”تم سے پہلے مرنا چاہتا ہوں میں۔“ اسے چلتے ہوئے ٹھوکر لگی۔ کوئی چیز جیسے اس کے جسم سے ایک لمحہ کے

لیے اسے تھرائی، کوئی گزری تھی۔ وہ جو جنت و جہنم کی پھر رہی تھی اس سے پہلے جو ”شے“ ماننے کھڑی تھی وہ

اسے بھول گئی تھی۔ ان کا ساتھ سالوں کا تھا اور ان کا ساتھ مہینوں کا تھا۔ اس نے سالوں میں کبھی جدائی محسوس

نہیں کی تھی لیکن وہ ان ہفتوں کا ساتھ ختم ہونے کا سوچ کر بھی لرز گئی تھی۔

”تم کیوں کہہ رہے ہو اس طرح؟“ وہ رک گئی اور اس نے سالار سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”تم نے ہی تو کہا تھا کہ شاید مجھے تم سے پہلے جنت مل جائے۔“

”لیکن میں نے مرنے کا نہیں کہا۔“

”کیا اس کے بغیر مل سکتی ہے؟“ وہ بول نہیں سکی۔ نیم تاریکی میں اس روش پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے

وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر سالار نے اس کی آنکھوں میں پانی اُڑتے دیکھا تھا۔

”کھٹیک ہے، ہو مرضی کہو۔“ اس کی آواز میں خفگی تھی۔

سالار نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جیسے معذرت خواہانہ انداز میں دیا۔

”میں نے صرف تمہاری بات دہرائی تھی۔“

”اور میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم نے نکالا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ دونوں پھر چلنے لگے۔

”کیا تم جنت میں مجھے اپنا پارٹنر منتخب کرو گی؟“

چند قدم چلنے کے بعد اس نے سالار کو نرم آواز میں کہتے سنا۔ وہ بول نہیں سکی۔ وہ بہس پڑا۔

”یعنی نہیں۔“

”میں نے یہ کب کہا؟“ وہ رک گئی۔

”لیکن تم نے کچھ بھی کب کہا؟“

”میں سوچ رہی تھی۔“

”سوچ لیا؟ پھر اب بتاؤ۔“ وہ بہس پڑی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”جنت کی بات غم نے شروع کی تھی۔“ اس نے سالار کا چہرہ دیکھا۔

”شاید۔“ وہ خاموش کھڑا سے دیکھتا رہا۔

”تمہیں یقین نہیں ہے؟“ اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

”یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اگر تم جنت میں پہنچ گئے تو پھر تمہیں یہی چننا پڑے گا۔“ اس نے مذاق کیا۔

”اور اگر کوئی اور بھی پہنچ گیا تو؟“ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آیا تھا۔ اس ”اور“ کا تعارف نہ امان نے اٹکا تھا نہ سالار نے کروایا تھا۔ مگر اس ”اور“ نے اس کو سالار سے نظرسنچنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نظرسنچنے پر جاتی تو اجتماعی تکلیف نہ ہوتی سالار کو جتنی لب ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکتی ”بات اس کے انتخاب پر کبھی نہیں رہی تھی“ بات جلال کے انتخاب پر تھی۔ اس کا انتخاب جنت میں بھی شاید وہ کبھی نہ ہوتی۔ لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوڑے کھانے جیسی ذلت تھی۔ چپ بہتر تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی چپ سالار کو اس وقت کوڑے کی طرح لگی تھی۔

اس روش سے روشنیوں تک کا باقی فاصلہ خاموشی میں طے ہوا تھا۔



سکندر عثمان کو چند لمحوں تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے وہ پلاٹ تو بگ ہی نہیں سکتا۔ سالار کے نام ہے وہ۔“

انہوں نے احتشام الدین سے کہا۔ وہ ان کے ایک کاروباری دوست تھے ”اور چند منٹ پہلے انہوں نے سکندر عثمان کو فون کر کے ایک پلاٹ کی فروخت کے بارے میں شکایت کی تھی۔ ان کے کسی دوست نے ان ہی کے وکیل کے ذریعے ایک ایسا پلاٹ کچھ دن پہلے خرید لیا تھا جو سکندر عثمان کا تھا“ اور جس کو ایک ڈیڑھ سال پہلے احتشام الدین

نے خریدنے کی آفر کی تھی۔ لیکن سکندر نے جب انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ پلاٹ جائیداد کی تقسیم کے دوران سالار کے نام کر چکے تھے۔ البتہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی اس پلاٹ کو فروخت کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ احتشام الدین کو ترجیح دیں گے۔

”میرے وکیل کے ذریعے سارا پیپر ورک ہوا ہے۔ آپ کہیں تو آپ کو نوڈز پیپر میں پلاٹ کی منتقلی کا انڈیا بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آپ کے بیٹے نے یہ پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں بیچا ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میرے وکیل نے منتقلی کے بعد بتایا مجھے وہ بھی اتفاقاً۔“ کچھ دیر پہلے بتا دینا تو میں کبھی یہ پلاٹ کسی اور کو خریدنے نہ دیتا۔“

چند لمحوں کے لیے سکندر عثمان کا سر گھوم کر رہ گیا۔ پچھلے سال انہوں نے اپنی جائیداد کی تقسیم کر دی تھی۔ یہ ان دو پلاٹس میں سے ایک تھا جو سالار کے حصے میں آیا تھا۔

”میں ابھی سالار سے بات کر کے دوبارہ آپ سے بات کرتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے یکدم کہا۔

انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو بتائے بغیر پلاٹ بیچ سکتا ہے۔

سالار اس دن اسلام آباد میں تھا اور اس وقت اپنے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا جب اسے سکندر کی

کال ملی۔

”سالار! تم نے اپنا پلاٹ بیچ دیا ہے؟“

وہ اس وقت ایک سٹریٹ پر رکا تھا اور اس کے پیلو کہتے ہی سکندر نے دوسری طرف سے کہا۔

چند لمبے سالار کچھ بول نہیں سکا۔ پلاٹ کی فروخت کا سکندر کو اتنی جلدی پتا چل جائے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی چند لمحوں کی خاموشی نے سکندر کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔
 ”تم میرے آفس آؤ۔“ انہوں نے بے حد سرد مہری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔
 ”کب بچا تھا پلاٹ؟“ اس کے آفس پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہی سکندر نے اس سے کہا۔ ان کا لہجہ قلعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ اس کی جائیداد تھی لیکن وہ بچنے کے لیے نہیں دی گئی تھی۔
 ”پچھلے مہینے۔“ اس نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی۔

”کیوں؟“

”مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔“

”کس لیے؟“ سالار اس بار جواب دیتے ہوئے جھجکا۔

”کس لیے رقم کی ضرورت تھی؟“

”مجھے امامہ کو ایک رنگ خرید کر دینی تھی۔“ سکندر کو لگا کہ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔
 ”کیا؟“

”امامہ کے لیے ایک رنگ خریدنی تھی۔“ اسی نارمل انداز میں اس نے اپنا جواب دہرایا تھا۔

”لاکھ دولاکھ کی رنگ کے لیے تم نے پلاٹ بیچ دیا؟“

سکندر نے اس کے جواب سے بالکل غلط نتیجہ نکالا۔

”اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے، بینک سے پرسنل لون لے لیتے یا مجھ سے کہتے۔“

”میں لون لے کر اسے گفٹ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایک دولاکھ کی انگوٹھی نہیں تھی، کچھ زیادہ مہنگی تھی آپ اتنے پیسے کبھی نہ دیتے تھے۔“ وہ بڑی رمانیت سے کہہ رہا تھا۔

”گفٹ مہنگی ہوتی، چار یا پانچ لاکھ کی ہوتی۔ چلو دس لاکھ کی ہوتی۔ دے دیا میں تمہیں۔“

سکندر بے حد خفا خاصہ وہ پلاٹ پونے دو کروڑ کا تھا جسے وہ ویرہہ کروڑ میں بیچ آیا تھا۔

”دس لاکھ کی بات نہیں تھی۔“ سکندر نے اسے کہتے سنا۔

”پھر؟“ سکندر کے ماتھے پر ہل آئے۔ سالار نے اپنا گلا صاف کیا۔

”13.7“ یہ واحد طریقہ تھا جس سے وہ اس انگوٹھی کی قیمت، تین ہزاروں میں کہہ پایا تھا۔

”کیا۔“ سکندر کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

”13.7“ سالار نے ایک بار پھر گلا صاف کر کے اگلا لفظ کہا۔ سکندر کو چند لمبے سانس نہیں آیا۔ انہیں پہلی بار

اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔

”13.7 ملین کی رنگ دی ہے تم نے اسے؟“ ان کا ذہن جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ سالار سر جھکائے نیپل پر

پڑے، پیسے وٹ پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ فی الحال وہ اس کمرے میں کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔

”سالار ایک کروڑ ستائیس لاکھ روپے کی رنگ خرید کر دی ہے تم نے اسے؟“

سکندر عثمان کی خود بھی سمجھ نہیں آئی کہ انہوں نے اس سے دو بار وہ یہ کیوں پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔“ اس بار سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر بے چینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سالار نے نظریں چرائیں، وہ اب ان کے عقب میں دیوار

پر لگی پینٹنگ دیکھ رہا تھا، اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتا؟ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سکندر نے ریو الونگ چیئر کی

پشت سے ٹیک لگالی۔ وہ اگر اسے الو کا چمکا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہانہ شاعرانہ)